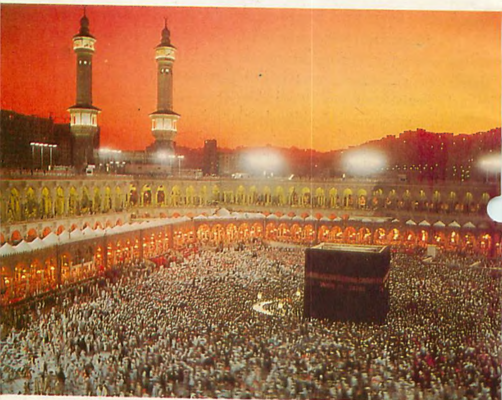
جون ۱۹۹۴ • شمارہ ۲۱۱

الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



THE HOLY MOSQUE IN MAKKAH

بھولنے والی بات کو بھلا دو تاکہ تم
یاد رکھنے والی بات کو یاد رکھ سکو

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London



الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۴ شمارہ ۲۱۱

AL-RISALA (Urdu) Monthly

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333

Fax : 91-11-4697333

Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-Mail)

Printed by Nice Printing Press, Delhi

صبر یا بے صبری

کسی آدمی کے ساتھ آپ کا مسئلہ پیدا ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آپ خود اس کے حل کی ذمہ داری قبول کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ مسئلہ کے حل کی ذمہ داری دوسرے آدمی کے اوپر ڈالیں۔ پہلا طریقہ صبر کا طریقہ ہے، اور دوسرا طریقہ بے صبری کا طریقہ۔

صبر کا مطلب خود ذمہ داری قبول کرنا ہے، اور بے صبری کا مطلب دوسرے کے اوپر ذمہ داری ڈالنا۔ یہی مختصر الفاظ میں صبر اور بے صبری کا خلاصہ ہے۔

صبر آدمی کے اندر مثبت نفسیات پیدا کرتا ہے۔ صبر والا آدمی پیش آمدہ صورت حال کو چیلنج سمجھتا ہے اور اس سے مقابلہ کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ساری طاقت کو محنت اور عمل کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا ہر لمحہ اور اپنے اثاثہ کا ہر ذرہ تعمیر کے راستوں میں لگاتا ہے۔ نئے حالات کا جھٹکا اس کو از سر نو بیدار کر دیتا ہے، بھرپور جد وجہد کے ذریعہ وہ مزید اضافہ کے ساتھ اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیتا ہے۔

اس کے برعکس بے صبر آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی پوری سوچ منفی ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن احتجاج اور شکایت کے رخ پر چل پڑتا ہے۔ وہ اپنے اثاثہ کو تعمیر خویش کے بجائے تخریب غیر کے محاذ پر لگا دیتا ہے، وہ اپنی کمی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوسرے کو غلط ثابت کرنے کو کام سمجھ کر اس میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ اپنی بے عملی سے محروم ہوا تھا تو اب وہ غلط عمل کی بنا پر اپنے کو مزید محروم کر لیتا ہے۔

صبر کا مطلب سوچ کر کرنا ہے اور بے صبری کا مطلب بے سوچے سمجھے کرنا۔ صبر منصوبہ بند عمل ہے اور بے صبری عجلت کی کارروائی۔ صبر حالات کا اندازہ کر کے حالات سے نپٹنا ہے اور بے صبری حالات کا اندازہ کیے بغیر حالات میں کود پڑنا۔ صبر دانشمندانہ تدبیر ہے اور بے صبری جذباتی ہنگامہ آرائی۔ صبر انجام کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے متحرک ہونا ہے اور بے صبری انجام کار سے بے پروا ہو کر حرکت میں آجانا۔

صبر گویا اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جاننا ہے اور بے صبری گویا صرف اپنے آپ کو جاننا۔ پہلا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور دوسرا آدمی ہمیشہ ناکام۔

نماز کی طاقت

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایرانی سلطنت سے ٹکراؤ ہوا۔ اس جنگ میں ایران کا سپہ سالار رستم تھا۔ علامہ ابن خلدون نے رستم کے بارہ میں لکھا ہے :

کان رستمُ إذَا رأىَ المسلمينَ يجتمِعون للصلاة يقول : اكلَ عمرُ كبِدي، يُعلِّمُ الكِلابَ الآدابَ (مقدمہ ابن خلدون ۱۵۲)

رستم کا حال یہ تھا کہ جب وہ مسلمانوں کو دیکھتا کہ وہ نماز کے لیے اکٹھا ہو رہے ہیں تو وہ کہتا کہ عمر میرا کلیجہ کھا گیا۔ وہ کتوں کو آداب سکھا رہا ہے۔

اس زمانہ میں ایران میں مسجدیں نہیں تھیں۔ مسلم فوجیں میدانوں میں نماز پڑھتی تھیں۔ لوگ میدان میں جمع ہوتے۔ قاعدہ کے مطابق، ایک آدمی بطور امام آگے کھڑا ہوتا۔ بقیہ تمام لوگ صف باندھ باندھ پیچھے کھڑے ہو جاتے۔ رستم دیکھتا کہ تمام لوگ منظم ہو کر ایک امام کی پیروی میں کھڑے ہوتے ہیں۔ جھکتے ہیں۔ زمین پر اپنا سر رکھتے ہیں۔ رستم محسوس کرتا کہ اسلامی خلیفہ کے حکم کے تحت یہ مسلم فوج کو ڈسپلن کی تربیت دی جا رہی ہے۔ وہ آداب حیات (rules of behaviour) کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح ڈسپلن اور آداب حیات کی تربیت حاصل کر لیں وہ اتنے طاقت ور ہو جاتے ہیں کہ کوئی بھی انھیں زیر نہیں کر سکتا۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جتنے مسلمان نماز پڑھتے تھے، آج گنتی کے اعتبار سے اس سے بہت زیادہ لوگ ساری دنیا میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کی نماز کو دیکھ کر قوموں کے اوپر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ مگر آج کے مسلمانوں کی نماز میں اس قسم کی انقلابی تاثیر موجود نہیں۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کی نماز فی الواقع آداب حیات سیکھنے کے ہم معنی تھی۔ مگر آج کے مسلمانوں کی نماز بے روح رسم کے ہم معنی ہے۔ بظاہر آج بھی لوگ ایک امام کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ آج بھی وہ ایک امام کی پیروی میں اٹھتے اور بیٹھتے ہیں۔ لیکن وہ اگر زندہ فعل تھا تو یہ بے روح رسم ہے، اور بے روح رسم کبھی زندہ عمل کے برابر نہیں ہو سکتی۔

دانش مندانہ طریقہ

جارجز بیدال (۱۹۸۳-۱۸۹۹) ایک فرانسیسی لیڈر تھا۔ وہ اگرچہ ایک انتہا پسند آدمی تھا۔ تاہم اس کے بعض اقوال بہت دانش مندانہ ہیں۔ اس نے ایک بار کہا کہ کمزور کے پاس ایک زبردست ہتھیار ہوتا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی غلطیاں ہیں جو اپنے بارہ میں سوچتے ہیں کہ وہ طاقت ور ہیں :

The weak have one weapon; the errors of thos
who think they are strong. (George Bidault)

جب کوئی شخص یا گروہ اپنے آپ کو طاقت ور سمجھ لے تو اس کے اندر لازمی طور پر ایک "کمزور عنصر" پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اپنی حیثیت کا مبالغہ آمیز اندازہ ہے۔ وہ اپنی بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بنا پر ایسے اقدامات کرتا ہے جس کے تقاضوں کو قابو میں رکھنا اس کے بس میں نہ ہو۔ اس طرح وہ خود اپنی پیدا کردہ مشکلات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا امکان ہے جو کمزور فریق کے پاس اپنے طاقت ور فریق کے مقابلہ میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ مگر اس امکان کو واقعی طور پر استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کمزور فریق آخری حد تک صبر کی روش پر قائم رہے۔ وہ خاموش رہ کر فریق ثانی کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرے۔ وہ صرف اس وقت حرکت میں آئے کہ جب کہ فریق ثانی غلط اقدام کر کے اپنے آپ کو ناقابل عبور مشکلات میں پھنسا چکا ہو۔

اسلام کی تاریخ میں غزوۂ خندق اسی قسم کی ایک مثال ہے۔ مکہ کے مخالفین اسلام نے اپنی طاقت کے زعم میں آکر ایک بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ سفر کر کے مدینہ پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر حالات کے اعتبار سے یہ ان کے لیے ایک غلط اقدام تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "خندق" کی صورت میں اعراض کی پالیسی اختیار کی۔ مدینہ سے نکل کر جوابی حملہ کرنے کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ مدینہ کے اندر ٹھہر کر آنے والے وقت کا انتظار کرتے رہے۔

یہ طریقہ انتہائی کامیاب رہا۔ آنے والا لمحہ اپنے وقت پر آیا اور حملہ آوروں کو طوفان کے تنکے کی طرح بہا لے گیا۔

دو دنیائیں

سر آرتھر ایڈنگٹن (Arthur S. Eddington) مشہور انگریز سائنس داں ہے۔ وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۴۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے ——— طبیعاتی دنیا کی نوعیت :

The Nature of the Physical World (1928)

ایڈنگٹن نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ میں اپنی کرسی پر جس میز کے سامنے بیٹھا ہوں وہ دو میز (two tables) ہے۔ ایک میز وہ جو دکھائی دے رہی ہے۔ دوسری میز وہ جو دکھائی نہیں دیتی۔ دکھائی دینے والی میز بظاہر ٹھوس ہے۔ مگر دوسری میز جو دکھائی نہیں دیتی، اس میں بے شمار غیر مرئی الکٹران ہر لمحہ حرکت کر رہے ہیں۔ یہی حال پوری دنیا کا ہے۔ اس دنیا کا ایک ظاہر ہے اور دوسرا اس کا باطن ہے۔ عالم ظاہر کو ہم دنیا کہتے ہیں، اور عالم باطن کا نام آخرت ہے۔ موت عالم ظاہر سے نکل کر عالم باطن میں داخل ہونے کا نام ہے۔

موجودہ ظاہری دنیا آدمی کو دکھائی دیتی ہے، مگر دوسری، اس کے اندر چھپی ہوئی دنیا آدمی کو دکھائی نہیں دیتی۔ اس بنا پر انسان موجودہ دنیا کو حقیقی جانتا ہے، اور دوسری دنیا کو خیالی سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ آخرت کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ بھی اس کو بس دور کے ایک عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم آخرت کو ماننے کے باوجود وہ ان کی عملی اور حقیقی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

یہی انسان کی سب سے بڑی غفلت ہے۔ انسان وقتی دنیا میں مشغول ہو کر مستقل دنیا کو بھلا بیٹھا ہے۔ وہ عارضی دنیا میں کھویا ہوا ہے اور ابدی دنیا کو غیر اہم چیز کی طرح چھوڑے ہوئے ہے۔ وہ اپنے آج کی خاطر اپنے کل کو کھو رہا ہے۔ موت کے دن جب آدمی اس دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگا تو یہ اس کے لیے گویا پردہ ہٹنے کا دن ہوگا۔ اس دن وہ اپنی غفلت پر افسوس کرے گا۔ مگر اس دن اس کا افسوس کرنا کچھ کام نہ آئے گا۔

سائنسداں اپنی "دو میزوں" کو اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے، اس کے بعد ہی وہ سائنسداں بنتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنی آج کی زندگی میں "دو دنیاؤں" کو دریافت کر لے وہی صاحب معرفت ہے اور وہی خدا کی توفیق سے اگلے مرحلۂ حیات میں کامیاب ہوگا۔

مفلس کون

ایک بزرگ ایک بستی میں رہتے تھے۔ اس بستی میں غیر قوم کا ایک آدمی آیا۔ بستی والوں نے اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا۔ جب بات بڑھی تو بستی والوں نے اس کو اپنے لیے قومی عزت کا مسئلہ بنالیا۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ اس معاملہ میں اپنے ظلم کو چھپالیں۔ اب ہر ایک نے اصل قصہ کو بدل کر اس طرح بیان کرنا شروع کیا جس میں سارا قصور صرف غیر قوم کے آدمی کا ثابت ہو۔ بستی والے اس پورے معاملہ میں بالکل معصوم اور بے قصور نظر آئیں۔

اس معاملہ میں مذکورہ بزرگ سے پوچھا گیا تو انھوں نے واقعہ کی اصل حقیقت بتادی۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں سارا قصور بستی والوں کا ہے، اور غیر قوم کا آدمی اس معاملہ میں مظلوم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس پر بستی کے لوگ بزرگ موصوف پر خفا ہو گئے۔ اس سے پہلے مذکورہ بزرگ بستی کے اندر نہایت محترم حیثیت رکھتے تھے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ مگر اب ہر ایک نے ان کو برا کہنا شروع کر دیا۔ ان کو حقیر کیا گیا۔ ان پر جھوٹے الزام لگائے گئے۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے یہ بہتان بھی لگایا کہ بزرگ نے غیر قوم سے پیسہ لے لیا ہے، اس لیے وہ ان کی طرفداری کر رہے ہیں۔ وغیرہ۔

بزرگ کے خلاف ساری بستی میں اس قسم کے جھوٹے پروپگنڈے جاری تھے۔ لیکن بزرگ نے کبھی اس کا جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے معمول کے کاموں میں لگے رہے۔ آخر ایک روز بستی کا ایک آدمی ان کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ آپ کے خلاف اتنا زیادہ پروپگنڈا کیا جا رہا ہے اور آپ چپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی جواب نہیں دیتے۔ کیا آپ کو اپنی بدنامی پر کوئی پریشانی نہیں۔

بزرگ نے جواب دیا کہ مجھ کو پریشانی کیوں ہو۔ میں تو بالکل مطمئن ہوں۔ کیوں کہ یہ لوگ تو ایسا کر کے میرے گناہوں کو بانٹ رہے ہیں۔ وہ میرے گناہوں کا بوجھ مجھ سے اتار کر اس کو اپنے اوپر لے رہے ہیں۔ وہ مجھ کو اس قابل بنا رہے ہیں کہ میں ہلکا ہو کر آخرت کی دنیا میں داخل ہوں۔ اس کے بعد بزرگ نے یہ حدیث سنائی :

عن ابی هُرَیرۃَ رضی اللہُ عنہ اَنَّ رسُولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: "أتدرُونَ ما المفلس؟" قالُوا: المفلسُ فینا مَن لا دِرھمَ لہ ولا مَتاعَ۔ فقال: "إنَّ المفلسَ مِن اُمّتی مَن یأتی یوم القیامۃِ بصلاۃٍ وصیامٍ وزکاۃٍ، و یأتی قد شتمَ ھذا، وقذفَ ھذا، و أکلَ مال ھذا، وسفکَ دمَ ھذا، وضربَ ھذا، فیُعطیٰ ھذا مِن حسناتہ، وھذا مِن حسناتہ، فان فَنِیَت حسناتُہ قبل أن یُقضی ما علیہِ أُخِذَ مِن خطایا ھُم فطُرِحَت علیہ ثم طُرِحَ فی النار"۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ کوئی سامان۔ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے اور اسی کے ساتھ اس نے کسی کو برا کہا ہو اور کسی پر الزام لگایا ہو اور کسی کا مال کھایا ہو اور کسی کا خون بہایا ہو اور کسی کو مارا ہو۔ پھر اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دے دی جائیں۔ اور اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں اور حساب برابر نہ ہوا ہو تو مظلوموں کی گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے اور پھر اس کو آگ میں پھینک دیا جائے۔

یہ حدیث ایک طرف ان لوگوں کے لیے نہایت سخت ڈراوا ہے جو دوسرے انسانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ جو دوسروں کے خلاف غصب، بہتان، الزام تراشی جیسے جرائم میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ان کے اعمال نامہ میں کوئی نیکی ہو تو آخرت کے دن وہ نیکی ان کے کام آنے والی نہیں۔ اور اگر ان کے پاس نیکی نہ ہو تو ان کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ اپنے گناہوں کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی ان کے اوپر ڈال دیا جائے۔

دوسری طرف اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے تسکین کا سامان ہے جو مظلوم ہیں۔ جن کو ناحق ستایا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کو آخرت میں یہ خوش قسمتی ملنے والی ہے کہ ان کے گناہوں کا بوجھ ان کے ظالموں پر ڈال دیا جائے اور وہ ہلکے پھلکے ہو کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ یہ انجام ان کے لیے اس وقت ہے جب کہ انھوں نے اپنی مظلومیت پر اللہ کی خاطر صبر کر لیا ہو۔

جواز چھین لیجئے

ہندستان میں جنگ آزادی کے دو دور ہیں۔ ایک ۱۸۵۷ سے لے کر ۱۹۲۰ تک۔ دوسرا ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۷ تک۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ پہلے دور میں انگریزی حکومت نے آزادی کی مانگ کرنے والوں پر وحشیانہ مظالم کیے۔ مگر یہی انگریز ۱۹۲۰ کے بعد وحشیانہ مظالم کرنے سے رک گئے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ پہلے دور میں آزادی کی تحریک چلانے والے اپنی تحریک کو تشدد کے طریقہ پر چلا رہے تھے۔ مگر ۱۹۲۰ سے اس تحریک کے قائد مہاتما گاندھی بن گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ آزادی کی تحریک کو ہم عدم تشدد کے اصول پر چلائیں گے۔

مہاتما گاندھی نے جب تشدد کو ترک کیا تو اس کے ساتھ ہی انگریزی حکومت کا تشدد بھی ختم ہوگیا۔ کیوں کہ تشدد کرنے کے لیے ہمیشہ اس کا جواز (justification) درکار ہوتا ہے۔ پچھلے لوگ اپنے تشدد سے انگریز کو بھی تشدد کا جواز دے رہے تھے۔ جب آزادی کی مانگ کرنے والوں نے تشدد کو چھوڑا تو انھوں نے عین اسی وقت انگریز سے بھی اپنے خلاف تشدد کا جواز چھین لیا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے جب ایسا کیا تو ایک انگریز کلکٹر نے برٹش سکریٹریٹ کو تار دیا کہ براہِ کرم بذریعہ تار بتائیے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح مارا جائے :

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد کا جو مسئلہ ہے، اس کے حل کے لیے کچھ لوگ دفاع کا مشورہ دے رہے ہیں۔ یہ بالکل الٹا مشورہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دفاع اس مسئلہ کو صرف بڑھانے والا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اس مسئلہ کا ایک ہی یقینی حل ہے۔ وہ یہ کہ ظالم سے ظلم کا جواز چھین لیا جائے۔ ایک فریق جب سازش کے تحت اشتعال انگیزی کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ فریق ثانی اس سے بھڑک اٹھے۔ وہ مشتعل ہو کر کوئی جوابی کارروائی کرے۔ ایسے موقع پر جوابی کارروائی کرنا ظالم کو ظلم کا جواز فراہم کرنا ہے۔ اس وقت آپ تحمل سے کام لیجئے۔ آپ جوابی کارروائی نہ کیجئے۔ اس کے بعد آپ ظالم سے ظلم کا جواز چھین لیں گے۔ اور ظالم سے جب ظلم کا جواز چھین لیا جائے تو اس کے بعد وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس کرنے لگتا ہے کہ ہاتھ میں بندوق رکھتے ہوئے بھی وہ آپ پر فائر نہ کر سکے۔

۱۰ الرسالہ جون ۱۹۹۴

آزادیٔ فکر

والٹرلپمان (Walter Lippmann) ۱۸۸۹ میں نیویارک میں پیدا ہوا، ۱۹۷۴ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اپنی سیاسی اور صحافتی تحریروں کے ذریعہ اس نے شہرت پائی۔ اس کی کتاب رائے عامہ (Public Opinion) بہت مقبول ہوئی۔ وہ پہلی بار ۱۹۲۲ میں چھپی تھی۔ اس نے سیاست میں نفسیاتی اپروچ اختیار کرنے پر زور دیا۔

والٹرلپمان اپنے سنجیدہ افکار کی بنا پر کافی پڑھا جاتا تھا۔ اس کا ایک قول یہ ہے کہ ——— جب تمام لوگ ایک طرح سوچیں تو کوئی بھی شخص بہت زیادہ نہیں سوچتا :

When all think alike, no one thinks very much.

اس قول میں سادہ الفاظ میں بہت اہم بات کہہ دی گئی ہے۔ سوچنے اور جاننے کی باتیں اس دنیا میں بے شمار ہیں۔ اگر لوگوں کو سوچنے کی آزادی ہو تو ہر آدمی مختلف رخ پر سوچے گا۔ اس طرح مجموعی طور پر لوگ بہت زیادہ باتوں کو جان لیں گے۔ اور اگر ایسا ماحول بنا دیا جائے جس میں تمام لوگ ایک ہی رخ پر سوچیں تو ایسے ماحول میں لوگوں کی مجموعی واقفیت بھی بہت کم ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں فکری آزادی ہو۔ اختلاف اور تنقید کو پسند کیا جاتا ہو، وہاں علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں زندہ انسان ابھرتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں فکری آزادی نہ ہو، جہاں اختلاف اور تنقید کو برا سمجھا جاتا ہو وہاں علم کی ترقی رک جاتی ہے۔ لوگوں کے اندر ذہنی جمود پیدا ہوجاتا ہے۔ لوگ اس ذہنی پستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کو ایک شخص نے "ذہنی بونا پن" سے تعبیر کیا ہے۔

جب لوگوں کو اپنے اپنے انداز پر سوچنے کی آزادی ہوگی تو لازماً اختلاف رائے پیدا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر تنقید کریں گے۔ اب جو شخص تنقید کی مخالفت کرے وہ سادہ طور پر تنقید کا مخالف نہیں ہے بلکہ وہ ذہنی ارتقاء کا مخالف ہے۔ یاد رکھئے، اس دنیا میں ہمارے لیے انتخاب (Option) تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے، بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ اگر آپ تنقید کو بند کریں تو جو چیز باقی رہے گی وہ ذہنی جمود ہوگا نہ کہ بے تنقید۔

تنقید کے ماحول میں ذہنی ارتقاء ہوتا ہے، اور بے تنقید ماحول میں ذہنی جمود۔

غصہ میں

البتانو (Albetano) ایک قدیم رومی فلسفی ہے۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ جو آدمی غصہ میں ہو وہ ہمیشہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کر سکتا ہے جتنا کہ فی الواقع وہ کر سکتا ہے :

The angry man always thinks he can do more than he can.

ایک آدمی شراب کے نشہ میں ہو تو وہ آپے سے باہر ہوتا ہے۔ وہ اپنا سر پتھر سے ٹکرا دیتا ہے، خواہ اس کے نتیجہ میں پتھر نہ ٹوٹے بلکہ خود اس کا سر ٹوٹ جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب سے سرمست ہو کر وہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کر لیتا ہے۔ وہ ایسا اقدام کر بیٹھتا ہے جس کا انجام خود اس کے خلاف نکلنے والا ہو۔

یہی معاملہ غصہ کا ہے۔ غصہ کی حالت میں آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ لیتا ہے جتنا کہ واقعۃً وہ ہے۔ اس غلط اندازہ کی بنا پر وہ ایسی کارروائی کر گزرتا ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہوتی ہے۔ اس نادانی کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا غصہ اتر جائے۔ مگر اب غلط اقدام کے نتیجہ میں آنے والی تباہی آچکی ہوتی ہے۔ اس لیے اب صرف افسوس اس کے حصہ میں آتا ہے نہ کہ غلط کارروائی کے انجام سے حفاظت۔

اس کی ایک واضح مثال ہندستان میں پولیس اور مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے مسلمان پولیس پر غصہ ہو جاتے ہیں اور اس سے ٹکرا جاتے ہیں۔ اس ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ مسلمانوں کے یک طرفہ نقصان پر ختم ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ کا سبب یہی ہے کہ غصہ کی وجہ سے مسلمان اپنا اور مسلح پولیس کا فرق سمجھ نہیں پاتے۔ اگر وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچیں تو وہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ کریں گے اور کبھی بھی پولیس سے نہ ٹکرائیں گے۔ مگر غصہ کی بنا پر وہ اپنی طاقت کا زیادہ اندازہ کر لیتے ہیں اور غیر ضروری طور پر پولیس سے لڑنے لگتے ہیں اور پھر یک طرفہ طور پر نقصان اٹھاتے ہیں۔

غصہ کی حالت میں کبھی اقدام نہ کیجئے۔ فریق ثانی کے مقابلہ میں اپنی کارروائی ہمیشہ اس وقت کیجئے جب کہ آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہو۔ اس کے بعد آپ بیشتر نقصانات سے اپنے آپ بچ جائیں گے۔

زندگی کا معاملہ

بازار میں تمام چیزیں ضروری قیمت دینے کے بعد ملتی ہیں۔ بازار کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے —— جتنا دینا، اتنا پانا۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ یہی اصول پوری انسانی زندگی کے لیے بھی ہے۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ تم دنیا کو اپنا بہترین دو، اور تمہاری طرف بھی دنیا کا بہترین واپس آئے گا :

Give the world the best you have, and the best will come back to you.

اگر آپ لوگوں کے خیر خواہ ہوں تو لوگ بھی آپ کے خیر خواہ ہوں گے۔ اگر آپ لوگوں سے میٹھا بول بولیں تو لوگوں کی طرف سے بھی آپ کو میٹھے بول کا تحفہ ملے گا۔ آپ لوگوں کے ساتھ محبت کرنے والے بنیں تو لوگ بھی آپ کے ساتھ محبت کرنے والے بن جائیں گے۔

یہ دنیا لین دین کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی وہی پاتا ہے جو اس نے دوسروں کو دیا ہو۔ یہاں دوسرے لوگ کسی آدمی کے لیے وہی کچھ ثابت ہوتے ہیں جو کہ وہ خود دوسروں کے لیے ثابت ہوا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اچھا ماحول پانا آدمی کے اپنے اختیار میں ہے۔ آپ دوسروں کے دوست بن جائیے، اس کے بعد آپ کو بھی دوستوں سے بھرا ہوا ماحول مل جائے گا۔ آپ دوسروں کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کیجئے، اس کے بعد آپ بھی اپنے گرد و پیش ایسے پڑوسی پالیں گے جو آپ کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کریں۔ آپ دوسروں کو فائدہ پہنچائیے، اس کے بعد آپ کو بھی زندگی گزارنے کے لیے ایسی دنیا مل جائے گی جہاں ہر ایک آپ کو فائدہ پہنچانے میں مصروف ہو گا۔

اگر آپ پھول بن کر رہنا جانتے ہوں تو آپ خود بخود اپنے رہنے کے لیے پھولوں کی کیاری پالیں گے۔ اور اگر آپ کے وجود کے ساتھ کانٹے لگے ہوئے ہوں تو اس کے بعد آپ کو زندگی گزارنے کے لیے جو دنیا ملے گی وہ صرف کانٹوں کا جھاڑ جھنکاڑ ہو گا۔

اس کا سبب

یہ ایک واقعہ ہے کہ انڈیا کے مسلمان، ہندوؤں کے مقابلہ میں، تعلیم اور اقتصادیات میں پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس کی توجیہہ کرتے ہوئے ایک ہندو دانشور (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ فروری ۱۹۹۴) نے لکھا ہے کہ آزاد ہندستان میں ہندو خوش حال ہیں، کیوں کہ ان کے مذہب نے جدیدیت اور ترقی کے راستہ کو اپنایا۔ جب کہ مسلمان پس ماندہ رہ گئے، کیوں کہ ان کا مذہب صرف ماضی کی طرف دیکھتا رہا:

Hindus have prospered in independent India because their religion adopted the road to modernity and progress, while Muslims remained backward because their religion turned its gaze towards the past.

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذکورہ فرق بجائے خود ایک واقعہ ہے۔ مگر اس کی مذکورہ توجیہہ درست نہیں۔ اسلام ہرگز یہ نہیں سکھاتا کہ تم پیچھے کی طرف دیکھتے رہو، اور ترقی کی باتوں کو نظر انداز کر دو۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا سبب ان کے نااہل لیڈر ہیں، نہ کہ اسلام۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب نئی ترقیوں کا ظہور ہوا تو عین اس وقت ایک اور واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ مسلمانوں نے اپنا سیاسی اقتدار اور تہذیبی برتری کھو دی۔ مغربی قومیں جو نئی ترقیوں کو لائی تھیں، وہی وہ قومیں بھی تھیں جنھوں نے ساری دنیا میں مسلمانوں کو مغلوب کر کے ان کے اوپر اپنا سیاسی اور تہذیبی غلبہ قائم کر لیا تھا۔

ہمارے اس دور کے لیڈروں نے ساری دنیا میں مغربی قوموں کے خلاف سیاسی تحریکیں کھڑی کر دیں۔ انھوں نے خود بھی مغربی قوموں سے نفرت کی اور مسلمانوں کو بھی ان کے خلاف نفرت میں مبتلا کر دیا۔ یہی نفرت وہ چیز ہے جو مسلمانوں کے لیے جدید ترقیات کے میدان میں آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا سبب اسلام نہیں ہے، بلکہ وہ مصنوعی نفرت ہے جو ہمارے ناعاقبت اندیش لیڈروں نے مسلمانوں کے اندر پیدا کی۔ یہی نفرت اس میں رکاوٹ بن گئی کہ مسلمان مغربی قوموں کو اعتدال و انصاف کی نظر سے دیکھیں اور ان کی طرف سے آنے والی ترقیاتی چیزوں کو اختیار کر لیں۔

یہ انسان

بلیز پاسکل ایک فرانسیسی فلسفی اور سائنس داں ہے۔ وہ ۱۶۲۳ میں پیدا ہوا، اور ۱۶۶۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ——— وسیع خلا کے اعتبار سے کائنات میرا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایٹم کی مانند مجھ کو نگلے ہوئے ہے۔ مگر خیال کے اعتبار سے میں اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہوں :

By space the universe encompasses and swallows me as an atom; by thought I encompass it. (Blaise Pascal)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے دو متضاد صفت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ایک طرف اُس کا ذہن ہے۔ اپنی ذہنی سوچ کے اعتبار سے انسان اپنے آپ کو لا محدود پاتا ہے۔ وہ سب کچھ سوچ سکتا ہے۔ ہر طرف اپنا خیال دوڑا سکتا ہے، اُس کے خیال پر بظاہر یہاں کوئی حد بندی نہیں۔

مگر اپنے جسمانی وجود کے اعتبار سے انسان انتہائی محدود ہے۔ وہ بے شمار قسم کی محدودیتوں میں بندھا ہوا ہے، اور سب سے بڑی محدودیت جس سے انسان دوچار ہوتا ہے وہ موت ہے۔ موت آدمی کی ہر بڑائی کی نفی کر دیتی ہے۔

یہی وہ چیز ہے جس میں آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ آدمی کو عظمتوں کے درمیان اپنے بے عظمت ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔ اس کو لا محدود کی فضا سے نکل کر اپنے محدود ہونے کا علم حاصل کرنا ہے۔ اس کو آزادی کے ماحول میں پابندی کو قبول کرنا ہے۔

انسان اس دنیا میں حالتِ امتحان میں ہے۔ اس کا امتحان میں پورا ہونا یہ ہے کہ وہ فکری وسعت کے باوجود اپنی عملی محدودیت کو جانے۔ وہ اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے بچائے۔ وہ اپنے آزادارادہ کو حقیقت پسندی کے دائرہ میں استعمال کرے۔

جانور کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا جتنا عمل ہے اتنا ہی ان کی سوچ۔ اس لئے جانوروں کا معاملہ زندہ مشین جیسا ہے۔ مگر انسان کی سوچ کی حد اس کے عمل کی حد سے بہت زیادہ ہے۔ سوچ اور عمل کے اس فرق میں توازن کو پا لینے ہی کا نام اعلیٰ انسانیت ہے۔

صبر اور دعوت

صبر داعی کا اخلاق ہے۔ صبر ہی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ کوئی شخص دعوتی مواقع کو استعمال کر سکے۔ جو آدمی ناخوش گوار باتوں پر صبر کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ اس دنیا میں کبھی داعی کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

سر جیمز جینز مشہور انگریز سائنسداں ہے۔ اس نے طبیعیات اور فلسفہ (Physics & philosophy) کے نام سے ۱۹۴۱ میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں اس نے اعتراف کیا کہ کائنات کے سائنسی مطالعہ نے ہم کو جہاں پہنچایا ہے اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا دروازہ کھولنا ممکن ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کا ہینڈل حاصل کر سکیں :

It almost seems to suggest that the door may be unlocked, if only we could find the handle. (p. 216)

انگریز سائنس داں نے جس وقت یہ سطریں لکھی ہیں عین اس وقت ساری دنیا کے مسلمان انگریزوں کی سیاسی بالادستی پر بھڑک کر ان کے خلاف خوں آشام لڑائی میں مصروف تھے۔ وہ انگریز کو صرف ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ انگریز کی سیاسی بالادستی پر وقتی طور پر صبر کر لیتے تو اچانک انھیں دکھائی دیتا کہ انگریز قوم حقیقت کے دروازے کھولنے کے لیے جس "ہینڈل" کی تلاش کر رہی ہے وہ ہینڈل ان کے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

اس واقفیت کی صورت میں انگریز کے بارے میں ان کی پوری نفسیات بدل جاتی۔ اب وہ انگریز کو اپنا مدعو سمجھتے نہ کہ اپنا حریف۔ اس کے بعد وہ انگریز کی ہلاکت چاہنے کے بجائے اس کی ہدایت چاہنے لگتے۔ وہ انگریز کی اصلاح کے لیے دعا کرتے اور اس کے خیر خواہ بن کر اس سے یہ کہتے کہ حقیقت کی منزل تک پہنچنے کے لیے تم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ تمہارے خدا نے پیشگی طور پر قرآن کی صورت میں تمہارے لیے بھیج دیا ہے۔

صبر دعوت کی لازمی شرط ہے۔ جہاں صبر نہ ہو وہاں دعوت بھی یقینی طور پر نہیں ہوگی۔

مسلمان اور جدید تحدیات

موجودہ زمانہ کے مسلمان سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسائل کا شکار ہیں۔ ان مسائل کے خلاف ان کی جدوجہد ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت مسلم رہنماؤں کا عام ذہن یہ تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا اصل سبب مغربی قوموں کا سیاسی غلبہ ہے۔ اگر مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو جائے تو اس کے بعد ہمارے تمام مسائل کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

ایشیا کے مسلمان سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسائل کا شکار ہیں، اس کے خلاف ان کی جدوجہد ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت مسلم رہنماؤں کا عام ذہن یہ تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا اصل سبب مغربی قوموں کا سیاسی غلبہ ہے۔ اگر مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو جائے تو اس کے بعد ہمارے مسائل کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یہ نشانہ پورا ہو گیا۔ اس کے بعد تمام مسلم علاقے مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے مسائل ختم نہیں ہوئے۔ وہ بدستور پوری شدت کے ساتھ آج بھی باقی ہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا غلبہ سادہ طور پر صرف سیاسی غلبہ نہ تھا۔ وہ دراصل جدید صنعتی تہذیب کا نتیجہ تھا۔ سیاسی غلبہ کے خاتمہ کے باوجود صنعتی تہذیب کی فاتحانہ حیثیت بدستور انھیں مغربی قوموں کو حاصل تھی، اس لیے ان کا غلبہ بھی بدستور جاری رہا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ غلبہ براہ راست تھا، اور اب یہ غلبہ بالواسطہ انداز میں ہے۔

اس منفی انجام کو دیکھنے کے بعد کچھ مسلم دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری اصل کمی صنعتی پس ماندگی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس کمی کو دور کرنا ہوگا۔ ہمیں دوسری قوموں کی طرح ایک بڑی صنعتی طاقت بننا ہے۔ اس کے بغیر ہماری قسمت بدلنے والی نہیں۔

مگر یہ بھی ہمارے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ کیوں کہ زمانہ ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔ وہ مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم صنعتی ترقی کی طرف بڑھنا شروع کریں تو ساری کوشش کے بعد جب ہم انڈسٹریل دور میں داخل ہوں گے تو، الون ٹافلر کے الفاظ میں، مغربی قومیں سپر انڈسٹریل

دور میں داخل ہو چکی ہوں گی۔ اس طرح ہم بدستور پیچھے رہیں گے اور ہمارا اصل مسئلہ اس کے بعد بھی غیر حل شدہ پڑا رہے گا۔

آج مسلمان جس قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ اور سیاسی، اقتصادی، صنعتی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر جو تحدیات ان کو درپیش ہیں، وہ کوئی نئی صورت حال نہیں ہے۔ اس قسم کے حالات کا تجربہ امت مسلمہ کی طویل تاریخ میں بار بار مختلف شکلوں میں پیش آتا رہا ہے۔ تاریخ مزید بتاتی ہے کہ ہر خطرہ یا ہر چیلنج سے گزرنے کے بعد امت پہلے سے زیادہ طاقت ور اور مستحکم ہو گئی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے پہلے امت کو جب اس قسم کے مسائل اور تحدیات سے دوچار ہونا پڑا تو کیا صورت پیش آئی اور کس طرح اس کا مقابلہ کیا گیا۔ اس کا جواب تاریخ کی روشنی میں صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ یہ کامیابی اسلام کی دعوتی طاقت کے ذریعہ حاصل کی گئی۔

تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں تاتاریوں نے عالم اسلام کو غیر معمولی نقصان پہنچایا۔ وحشی اور خوں خوار تاتاریوں کی طاقت بظاہر ناقابل شکست بنی ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد اسلام کی دعوتی طاقت ظاہر ہوئی۔ اس نے تاتاری قوم کو مسخر کر لیا۔ ایک مستشرق نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے:

The religion of the Muslims had conquered where their arms had failed. (p. 488)

آج مسلمانوں کو اسلام کی اسی دعوتی طاقت کو لے کر اٹھنا ہے۔ اگر وہ دعوت الی اللہ کے کام کو صحیح طور پر انجام دے سکیں تو یقینی طور پر ان کے حالات بدل جائیں گے۔ اس کے بعد وہی ہو گا جس کی خبر قرآن میں دی گئی ہے کہ جو لوگ بظاہر ہمارے دشمن نظر آتے ہیں وہ ہمارے دوست اور ساتھی بن جائیں گے (۴۱ : ۳۴)

موجودہ زمانہ میں اسلام کے دعوتی عمل کو زندہ کرنے کے مواقع غیر معمولی حد تک بڑھ گئے ہیں۔ ایک طرف یہ ہوا ہے کہ مذاہب کے علمی مطالعہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب غیر معتبر ہیں۔ کسی بھی دوسرے مذہب کو تاریخی اعتباریت حاصل نہیں۔ جبکہ اسلام ہر علمی جانچ میں معتبر ثابت ہوا ہے۔ اس طرح گویا اسلام اس حیثیت میں ہے کہ وہ بلا مقابلہ کامیابی حاصل کر سکے۔

جہاں تک انسانی ساخت کے ازموں کا تعلق ہے، وہ بھی سب کے سب ناکام ہو چکے ہیں، اس سلسلہ کا آخری فیصلہ کن واقعہ کمیونسٹ ایمپائر کا ٹوٹنا ہے۔ کمیونسٹ ایمپائر کی موجودگی میں دنیا اس غلط فہمی میں تھی کہ ہمارے پاس ایک آئیڈیالوجی موجود ہے۔ مگر ۱۹۹۱ میں جب کمیونسٹ ایمپائر ٹوٹ کر گر گئی تو اس بھرم کا بھی خاتمہ ہو گیا اب ساری دنیا میں ایک فکری اور نظریاتی خلا (ideological vacuum) ہے۔ اس خلا کو صرف اسلام پُر کر سکتا ہے۔

اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ مسلمان اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھیں اور اس کے ذریعہ سے اقوام کی فکری تسخیر کرکے اسلام کی نئی تاریخ بنائیں۔

اب ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم خود اپنی تاریخ کے اس تجربہ کو نئے حالات میں دہرائیں جو بار بار اپنی کامیابی کو ثابت کر چکا ہے۔ یعنی ہم موجودہ مسائل اور تحدیات کا مقابلہ اسلام کی دعوتی طاقت کے ذریعہ کریں۔ مسلمان اپنی طویل تاریخ میں ہمیشہ دعوت کی طاقت سے فتح یاب ہوئے ہیں، اور آج بھی یقینی طور پر اسی کے ذریعہ وہ فتح یاب ہو سکتے ہیں۔

دعوت کی تسخیریت کا راز اس کی نفع بخشی کی صفت ہے۔ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کے لیے نافع ہو، اس کو لوگوں کے درمیان قبولیت اور جاؤ ملے۔ اسلام سب سے بڑی نفع بخش چیز ہے ـــــــ وہ انسان کی تلاش حق کا جواب ہے، وہ انسان کو سچا نظریۂ حیات دیتا ہے۔ وہ انسان کو ذہنی سکون عطا کرتا ہے، وہ انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ انسان کو اس شاہراہ کی دریافت کراتا ہے جس پر چل کر وہ دنیا سے لے کر آخرت تک محفوظ سفر طے کر سکے۔

بلاشبہ اس سے زیادہ نفع بخش اور کوئی چیز انسان کے لیے نہیں۔ اس لیے اس سے زیادہ قابل قبول چیز بھی انسان کے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

اسلام کا یہ تسخیری پہلو ایک معلوم اور مشہور حقیقت ہے۔ اگر آپ کے پاس زیادہ تحقیقی مطالعہ کا موقع نہ ہو تو آپ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ ریاض سے نکلنے والے عربی ہفت روزہ الدعوہ کو یا مکہ سے نکلنے والے اخبار العالم الاسلامی کو پڑھ لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے تقریباً ہر شمارہ میں اسلام کی دعوتی تسخیر کی خبریں موجود ہیں۔

مثال کے طور پر اسی مہینہ میں الدعوہ (ریاض) کے شمارہ ۱۲ اگست ۱۹۹۳ میں ایک خبر اس سرخی کے ساتھ چھپی ہوئی ہے کہ ۹۰۰ شخص یعتنقون الاسلام۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے چند مہینے میں جنوبی افریقہ میں تقریباً نو سو آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان میں سے چار مسیحی پادری ہیں۔

اسی طرح اسی مہینہ میں العالم الاسلامی (مکہ) کے شمارہ ۱۶-۲۲ اگست ۱۹۹۳ کے انگریزی حصہ میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس کی سرخی یہ ہے :

653 embrace Islam in UAE

اس سرخی کے تحت چھپنے والی خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۱۴۱۳ھ کے ایک سال کے دوران صرف عرب امارات میں بیرونی ملکوں کے جو لوگ دین اسلام میں داخل ہوئے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۶۵۳ ہے۔

یہ دونوں خبریں صرف بطور مثال نقل کی گئی ہیں۔ ورنہ اس طرح کے دعوتی واقعات ہر روز دنیا کے ہر حصہ میں تقریباً تسلسل کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔

اسلامی دعوت کی اہمیت نظری طور پر بھی مسلّم ہے اور عملی تجربہ میں بھی اس کی افادیت پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ دعوت کو باقاعدہ ملّی پروگرام قرار دے کر اس کے لیے منظم اور منصوبہ بند عمل شروع کر دیا جائے۔

دعوتی طریق کار کی کامیابی جزئی طور پر آج بھی ظاہر ہو رہی ہے، جب کہ ابھی دعوت کا کام منظم طور پر اور قومی فیصلہ کے تحت انجام نہیں دیا جا رہا ہے۔ پچھلے سو سال میں بے شمار سیاسی قربانیاں دی گئی ہیں۔ مگر اس سے ابھی تک کوئی حقیقی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ جب کہ اسی مدت میں دعوت نے لاکھوں انسانوں کو متاثر کر کے انھیں اسلام کے دائرہ میں داخل کیا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ واحد غیر محرف مذہب ہے۔ ہر قسم کی علمی صداقتیں اس کے حق میں جمع ہو چکی ہیں۔ ان چیزوں نے اسلام کو اپنی ذات میں ایک موثر طاقت بنا دیا ہے۔ چنانچہ ہر ملک میں اور دنیا کے ہر علاقہ میں لوگ برابر اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔

آخری بات

قرآن سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے مسائل و مشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ وہ ان قوموں کے اوپر دعوت الی اللہ کا کام کریں جن کی طرف سے یہ مسائل اور مشکلات پیش

آرہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ تحدیات اقوام کا مقابلہ کرنے کی سب سے زیادہ کارگر تدبیر دعوت اقوام ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی حسب ذیل آیت ایک فیصلہ کن رہنما کی حیثیت رکھتی ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

(المائدہ ٦٧)

اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا، اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

قرآن کی یہ آیت واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ امت محمدی کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ جب وہ قوموں کے اوپر دعوت کا کام کرے تو وہ ان کے مظالم سے پوری طرح محفوظ رہے۔

جب قرآن میں یہ واضح رہنمائی موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ عصر حاضر کے مسلمان مشکلات و مسائل کا شکار ہونے کے باوجود، دعوت الی اللہ کی منصوص تدبیر کے لیے متحرک نہ ہو سکے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے صبر نہ کر سکنا۔ صبر دعوت الی اللہ کی واحد لازمی قیمت ہے۔ جو لوگ صبر کی قیمت ادا نہ کر سکیں وہ دعوت الی اللہ کا کام بھی نہیں کر سکتے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی اس آیت کا مطالعہ کیجئے:

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ

(ابراہیم ١٢)

اور جو تکلیف تم ہمیں دو گے اس پر ہم صبر ہی کریں گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

یہ بات پیغمبروں نے اپنی مخاطب قوموں سے اس وقت کہی جب کہ ان کی قوم ان کی مخالف ہو گئی اور ان پر زیادتیاں کرنے لگی۔ یہ زیادتی اور اذیت دیگر اقوام کی طرف سے ہمیشہ داعیٔ حق کو پیش آتی ہے۔ مگر داعی کو ان تمام زیادتیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے تاکہ اس کی مثبت نفسیات بھنگ نہ ہونے پائے، تاکہ وہ مخاطبین کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے ان کے اوپر دعوت کے عمل کو جاری رکھے۔

اس آیت میں توکل سے مراد اللہ کے اس بتائے ہوئے طریقہ پر یقین کرنا ہے۔ یعنی داعی پوری طرح اس بات پر متوکل ہو جائے کہ وہ مخاطبین کے ظلم کے خلاف براہ راست کوئی کارروائی نہ کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا جو کام ان کے اوپر انجام دے گا۔ وہ پیغام الٰہی کی پیغام رسانی کے ساتھ اس کے قومی مسائل کا بھی یقینی حل بن جائے گا۔

آج اہل اسلام کو اسی توکل علی اللہ کا ثبوت دینا ہے۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں اس توکل کا ثبوت دے دیں تو اس کے بعد ان کے تمام مسائل اس طرح حل ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

یہ مقالہ الملتقی الاسلامی الاول لدول آسیا (کولمبو) میں ۲۷ اگست ۱۹۹۳ کو پڑھا گیا۔ یہ کانفرنس سعودی عرب کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ کے تحت کی گئی۔

ایک امکان

انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی) نے اپنے شمارہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۲ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر مسٹر مرلی منوہر جوشی کا انٹرویو چھاپا تھا۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کو ہندو بتایا تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مسٹر ایس ایس نیگی (دہرہ دون) نے انڈیا ٹوڈے (۲۹ فروری ۱۹۹۲) میں لکھا ہے کہ مسٹر جوشی کہتے ہیں مسلمان ہندو ہیں کیوں کہ وہ ہندستان میں رہتے ہیں۔ اور انڈین ہندوؤں کے لیے انگریزی لفظ ہے۔ لیکن اگر ہندو کا لفظ قومیت سے تعلق رکھتا ہے تو آخر اس کو مذہب کیوں کہا جائے :

'Murli Manohar Joshi says that Muslims are Hindus because they live in Hindustan. And Indian is the English word for Hindus. But then if the word Hindu refers to a nationality, why call it a religion at all? (S.S. Negi)

یہ جواب نہایت صحیح ہے۔ نیز یہ کہ یہ فرقہ پرست ہندو کی بات کا جواب خود ہندو کی طرف سے ہے اس لیے اس میں جو تاثیر ہے وہ کسی مسلمان کے جواب میں نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں میں وہ لوگ بہت چھوٹی اقلیت ہیں جو فرقہ پرستانہ انداز کی باتیں کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ اور اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پر اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہوا تو سب سے پہلے جس شخص نے اس کے لیے قربانی دی وہ اکشے برہم چاری تھے۔ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ نے کثرت سے اس موضوع پر منصفانہ مضامین لکھے۔ انڈین ہسٹری کانگرس کے پروفیسروں نے تقریباً متفقہ طور پر اس معاملہ میں فرقہ پرستوں کی مذمت کی۔ ہندوؤں نے ایک سے زیادہ بار "اجودھیا مارچ" کیا۔ اس سلسلہ کا آخری مارچ وہ تھا جو ۳۰ مارچ ۱۹۹۲ کو مسٹر لائم سنگھ کی قیادت میں ایک ہزار ہندوؤں نے کیا۔ اگرچہ رام سینی گھاٹ پر لاٹھی چارج کر کے انھیں روک دیا گیا (ہندستان ٹائمس ۳۱ مارچ ۱۹۹۲) وغیرہ۔

مسلمانوں کے نااہل لیڈر اکثر اس طرح کے مواقع پر غلط اقدام کر کے معاملہ کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اگر یہ مسلم لیڈر چپ رہیں تو خود ہندوؤں میں ایسے لوگ اٹھیں گے جو ان مسائل میں زیادہ بہتر طور پر ہمارا بدل بن جائیں۔

ایک سفر

ستمبر ۱۹۹۲ میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے درمیان ایک طویل سفر ہوا۔ اس سفر کے دوران مختلف قسم کے تجربات ہوئے۔ اس کی روداد اختصار کے ساتھ یہاں لکھی جاتی ہے۔

۱۱ ستمبر کی رات کو گیارہ بجے کے بعد گھر سے دہلی ایر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں خوشگوار ہواؤں کے جھونکے استقبال کرتے ہوئے ملے۔ خیال آیا کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو سانس لینے کے لئے ہر لمحہ تازہ آکسیجن کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ کیا کہ آکسیجن کی مسلسل فراہمی کا انتظام فرما دیا۔ زمین کی سطح پر آدمی جہاں بھی جائے اس کے لئے زندگی بخش ہوا (آکسیجن) پیشگی طور پر موجود ہوگی۔ یہ انتظام اس بات کا خاموش اعلان ہے کہ کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک بامعنی منصوبہ بندی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو طلب اور رسد میں یہ کامل ہم آہنگی ممکن نہ ہوتی۔

میں ایر پورٹ کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قریب کی سیٹ پر ایک کافی بوڑھی خاتون بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں آیا کہ یہ معذور خاتون ایر پورٹ کی لمبی مسافت طے کرکے کس طرح ہوائی جہاز تک پہنچے گی۔ اتنے میں ایر پورٹ کا ایک باوردی آدمی مخصوص پہیہ والی گاڑی (Wheel chair) لے کر وہاں آگیا۔ گاڑی خوبصورت اور آرام دہ تھی۔ اس نے خاتون کو اس پر بٹھایا اور اس کو چلاتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ہوائی اڈوں پر ہر جگہ اس قسم کا مفت انتظام ہوتا ہے۔ مسافر کے لئے صرف اطلاع کر دینا کافی ہے۔ اس کے بعد ہوائی اڈہ یا ایر کمپنی کا آدمی گاڑی لے کر آئے گا اور مسافر کو اس پر بیٹھا کر احترام کے ساتھ اس کو جہاز تک پہنچا دے گا۔ معذور آدمی خصوصی توجہ کا مستحق ہوتا ہے۔ آخرت میں بھی معذوروں کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا، بشرطیکہ وہ اللہ کی نظر میں فی الواقع معذور قرار پائیں۔

اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایر پورٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ قصہ یاد آیا جو میں نے پاکستان کے اخبار نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۹۲ میں پڑھا تھا۔

پاکستان کے حکیم محمد سعید صاحب جون ۱۹۹۲ میں کراچی سے تیونس گئے تھے تاکہ ایک طبی کانفرنس

میں شرکت کرسکیں۔ وہ پاکستانی ایئرویز کے ذریعہ کراچی سے دہلی آئے۔ اور دہلی سے الیتالیہ کے ذریعہ براستہ روم وہ تیونس گئے۔ حکیم صاحب اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

" اندرا گاندھی ایئرپورٹ پر الاطالیہ سے جب میں نے سوال کیا کہ کیا میرا سامان جو تیونس کے لئے بک ہے، پی آئی اے سے الاطالیہ میں منتقل ہوگیا ہے۔ تو وہ حیران ہوئے، اچھا سامان ہے، مگر پی آئی اے نے تو ہمیں ذرا بھی اطلاع نہ دی۔ ان کا تو اب دفتر بھی بند ہوگیا ہے۔ نہ جانے سامان کہاں ہے۔ میں خود حیران ہوا کہ وہ خاتون جو مجھے وی آئی پی کا مرتبہ دینے آئی تھیں۔ انھوں نے میرے سامان کو لاوارث چھوڑ دیا۔ خاصی پریشانی ہوئی۔ اندرا ایئرپورٹ پولیس کے لوگ کام آئے۔ سب تلاش میں لگ گئے۔ بالآخر سامان مل گیا اور اسے الاطالیہ میں رکھوا دیا گیا اور میں ۱۲ بجے رات اندرا گاندھی ایئرپورٹ کے خوب صورت لاونج میں آکر بیٹھ گیا۔ (نوائے وقت، ۱۰ جولائی ۱۹۹۲)

ایک بار ایک پاکستانی دانشور نے لکھا تھا: " اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہنود و یہود ہیں۔" پاکستانی اخباروں کو مذکورہ قسم کے واقعات سے سبق لینا چاہئے اور اپنے عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا چاہئے۔

رات کو ایک بجے سوئس ایئر کی فلائٹ نمبر ۱۸۱ کے اندر داخل ہوا۔ جدید طریقہ کے مطابق ایئرپورٹ اور جہاز کے درمیان معلق پل (Aerobridge) کا انتظام تھا۔ اس کے ذریعہ آدمی نہایت آسانی کے ساتھ چلتا ہوا جہاز کے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ مگر مجھ کو ذاتی طور پر قدیم سیڑھی والا طریقہ زیادہ پسند ہے۔ قدیم طریقہ میں ایک رومانی لمس (romantic touch) ہے۔ یہاں قدیم اور جدید میں وہی فرق ہے جو گھوڑے اور موٹر سائیکل میں۔

راستہ میں انٹرنیشنل ہرالڈ ٹربیون (۱۱ ستمبر ۱۹۹۲) پڑھا۔ اس میں بہت سی سبق آمیز خبریں نظر سے گزریں۔ اس کے صفحہ ۲ پر پچاس سال کی چھپی ہوئی ایک خبر دوبارہ چھاپی گئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ کو واشنگٹن حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اس نے پچاس خاتون پائلٹوں کا انتخاب کیا ہے جو امریکہ میں ہوائی جہاز چلائیں گی۔ اس وقت ایئر ٹرانسپورٹ کمانڈ کے ڈپٹی چیف لفٹننٹ کرنل رابرٹ لو (Robert M. Love) نے پرفخر طور پر کہا تھا کہ اب میں یہ لفظ نہیں بولوں گا کہ ہمارا مین پاور، بلکہ یہ کہوں گا کہ مین اینڈ وومن پاور:

I shall not say our man power,
but of our man and woman power.

اس منصوبہ کے مطابق اب امریکہ (اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں) میں مرد پائلٹ اور خاتون پائلٹ کی تعداد برابر ہونی چاہئے۔ مگر ۱۹۴۲ کا یہ اعلان حقیقت سے زیادہ خوش فہمی پر مبنی تھا۔ میں نے بار بار مغربی ملکوں میں سفر کئے ہیں اور تقریباً ہر بڑی ہوائی کمپنی کے جہاز میں بیٹھا ہوں مگر میرے تجربہ میں ایک بار بھی کوئی خاتون پائلٹ نہیں ملی۔ خاتون پائلٹ آج بھی تقریباً نہیں کے برابر ہیں۔

فطرت کے مطابق اقدام آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے، اور فطرت کے خلاف اقدام صرف بربادی اور ناکامی کی طرف۔

سوئس ایر کا ماہ ستمبر کا فلائٹ میگزین (Swissair gazette) دیکھا۔ اس کے اداریہ میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت تقریباً تمام بڑی بڑی ہوائی کمپنیاں گھاٹے پر چل رہی ہیں۔ آئی اے ٹی اے (IATA) کی ممبر کمپنیوں کے بارہ میں اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۹۲ میں ان کی کل آمدنی ۳۰۰ ملین ڈالر ہوگی جب کہ ان کا مجموعی خرچ چھ بلین ڈالر ہوگا۔ سوئس ایر بھی خسارہ کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ چنانچہ اس کی موجودہ حکمت عملی ہے ——— پیداواری عمل کو بڑھانا اور خرچ کو گھٹانا:

raising productivity and reducing costs

سفر کے دوران جہاز میں اعلان کیا گیا کہ اب ہم جرمنی کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ یہ سن کر جرمنی سے متعلق کچھ یادیں تازہ ہوگئیں۔ جرمنی سے ہندستان کے کئی تاریخی واقعات وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک نیتاجی سبھاش چندر بوس کی جرمنی میں آمد ہے۔ وہ ان دنوں کلکتہ میں اپنے گھر کے اندر نظر بند تھے۔ انھوں نے اپنی داڑھی کو شیو کرنا چھوڑ دیا۔ دو مہینہ میں جب داڑھی بڑھ گئی تو انھوں نے مولوی کا بھیس بدلا اور کلکتہ سے بذریعہ ٹرین پشاور پہنچے۔ اور وہاں سے کابل گئے۔ اس کے بعد لمبا سفر طے کرتے ہوئے ۲ اپریل ۱۹۴۱ کو برلن پہنچ گئے۔

سبھاش چندر بوس چانکیہ کے اس اصول پر یقین رکھتے تھے کہ " دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے "۔ چنانچہ وہ برطانیہ کے دشمن اڈولف ہٹلر سے برلن میں ملے۔ ہٹلر کھلم کھلا مدد کرنے پر راضی نہ ہوا۔ البتہ اس نے مخفی طور پر ان کے لئے کئی مدد فراہم کی۔ انھوں نے برلن میں فری انڈیا سنٹر قائم کیا۔

اسی کے ساتھ انھوں نے جاپان سے ربط قائم کیا۔ جاپانیوں نے دوسری عالمی جنگ کی ابتداء میں جب پینانگ پر قبضہ کیا تو برطانی فوج کے بہت سے ہندستانی سپاہی گرفتار ہو کر جاپان لے جائے گئے۔ سبھاش چندر بوس کی درخواست پر جاپان نے ان ہندستانی سپاہیوں کو رہا کر کے انھیں سبھاش چندر بوس کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے دوسرے ہندستانی افراد کو ملا کر آزاد ہند فوج بنائی۔ اس تربیت یافتہ فوج کے تین ڈویژن تھے۔ ان میں سے ہر ڈویژن میں ۱۰ ہزار مسلح سپاہی تھے۔ اس کے علاوہ ۲۰ ہزار والنٹیر تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۳ میں سبھاش چندر بوس نے انڈیپنڈنٹ انڈین گورنمنٹ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد وہ رنگون کے راستہ سے ہندستان کی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں ان کا مقابلہ برطانی فوج سے ہوا۔ برطانی فوج کے پاس ہوائی جہاز تھے۔ مگر سبھاش چندر بوس کی فوج کسی ہوائی حمایت (aerial support) سے خالی تھی۔ چنانچہ اس کو شکست ہوئی۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۵ کو سبھاش چندر بوس ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گئے۔

سبھاش چندر بوس نے برٹش راج کے خلاف مسلح بغاوت (armed revolt) کا منصوبہ بنایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے خون دو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو آزادی دوں گا:

Give me blood and I promise you freedom.

ہزاروں آدمی سبھاش چندر بوس کی اس پکار سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنا خون پیش کر دیا۔ مگر مسٹر بوس سمیت ہزاروں آدمیوں کا خون کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکا۔ دوسری طرف مسٹر بوس مہاتما گاندھی کے سخت خلاف تھے۔ وہ گاندھی جی اور ان کے غیر متشددانہ اور مصالحانہ انداز (conciliatory attitude) کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو مہاتما گاندھی آزادی کا انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور سبھاش چندر بوس ناکام رہے۔

جرمنی میں ہم جنسی کے تعلقات کا رواج ہے۔ مگر اس قسم کے تعلق کو قانونی حیثیت حاصل نہیں۔ جیسا کہ مثلاً ڈنمارک اور نیوزی لینڈ میں ساتھ رہنے کے معاہدہ (cohabitation contract) کے نام پر موجود ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۹۲ کے آخر میں جرمنی کے تقریباً پچاس شہروں میں جرمن مردوں اور عورتوں کے ایک طبقہ نے مظاہرہ کیا۔ وہ سڑکوں پر گھومے اور یہ مانگ کی کہ ہم جنس کی شادی

کو قانونی حیثیت دے دی جائے۔ (same-sex marriage) یہ جوڑے اسی طرح ایک دوسرے کے وارث ہوں جس طرح عام منکوحہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے ایک جرمن مسافر سے کچھ سوالات کئے۔ میری عادت ہے کہ اکثر میں سوالات کی صورت میں گفتگو کرتا ہوں۔ اس نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میرا خیال ہے کہ یہ نامساوی قوانین جو کہ اس وقت ہمارے یہاں ہیں ان کا خاتمہ کر دینا چاہئے:

I think these unequal laws that we now have must be knocked down.

اس نے اپنا نام ایڈتھ ماریا اسٹال (Edith Maria Stoll) بتایا۔ میں نے کہا کہ نکاح کے موجودہ قوانین اَن ایکول نہیں ہیں بلکہ وہ نیچرل ہیں۔ یہ ایکول اور اَن ایکول کا مسئلہ نہیں، بلکہ نیچرل اور اَن نیچرل کا مسئلہ ہے۔

ہوائی جہاز کی چھت میں جگہ جگہ ویڈیو لگا ہوا تھا۔ اس پر جہاز سے متعلق معلومات تصویر کی صورت میں دکھائی جارہی تھیں۔ دنیا کا نقشہ بنا کر اس پر ایک لال لکیر رینگتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو بتا رہی تھی کہ اب جہاز کہاں پہنچا اور کس طرف بڑھ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ بتایا جارہا تھا کہ اب جہاز اپنی منزل سے کتنی دور ہے۔ آخری مرحلہ میں گنتی بتا رہی تھی کہ اب جہاز ۶۰ کیلومیٹر دور ہے، اب ۵۰ کیلومیٹر دور ہے، اب ۳۰ کیلومیٹر دور ہے۔ اس طرح کم ہوتے ہوتے گنتی آخر میں پہنچ گئی اور جہاز اپنی منزل پر اتر گیا۔

میں نے سوچا کہ یہی معاملہ انسان کی ذات کا بھی ہے۔ جوانی کی عمر تک زندگی اوپر کی طرف جاتی ہے۔ اس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے۔ بال میں سفیدی ظاہر ہوکر بتاتی ہے کہ اب دور زوال شروع ہوگیا۔ اسی طرح آنکھ، دانت اور دوسرے تمام اعضا کمزور ہونے لگتے ہیں۔ جسم کا ایک ایک حصہ آدمی کا ساتھ چھوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر وقت آجاتا ہے۔ موت سے پہلے ظاہر ہونے والے قدرت کے نشانات کو آدمی اگر پڑھ سکے تو موت کے امتحان میں پورا اترنا اس کے لئے آسان ہوجائے۔

جہاز ۳۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا آٹھ گھنٹہ میں دہلی سے نیویارک پہنچ گیا۔ میں نے

۱۱ ستمبر کو عشاء کی نماز نظام الدین (دہلی) کی قریش مسجد میں پڑھی تھی۔ ۱۲ ستمبر کو فجر کی نماز میں نے زیورک (سوئزرلینڈ) میں پڑھی۔ جب کہ دونوں مقامات کے درمیان تقریباً ۶۲۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

زیورک میں جہاز کی لینڈنگ بہت سہل تھی۔ جہاز نہایت سہولت سے رن وے پر اتر کر دوڑنے لگا۔ اتفاق سے اس وقت میں ہیرالڈ ٹریبون (۱۲ ستمبر) میں امریکہ کی اقتصادی حالت کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے اور آئندہ اس کو اس سے بھی زیادہ سخت اقتصادی مسائل کا سامنا ہے۔ اس رپورٹ کی سرخی یہ تھی:

(Hard landing ahead)

اس کو پڑھ کر اچانک میرا ذہن آخرت کی طرف مڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ دنیا میں تو ماہر پائلٹ اور موسم کی موافقت کی بنا پر "سہل لینڈنگ" میرے حصہ میں آئی ہے آخرت میں اگر "ہارڈ لینڈنگ" ہو تو وہاں کیا چیز ہوگی جو مجھے بچانے والی ثابت ہو۔

پائلٹ سے میں نے پوچھا کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ایک بے حد ٹکنکل بات ہے۔ تاہم آسان لفظوں میں میں کہوں گا کہ ہوائی جہاز کو ہم نہیں اڑاتے۔ بلکہ نیچر اڑاتی ہے۔ ہوائی جہاز کی چڑیا جیسی شیپ، اس کا پنکھا، ہوا کو آگے سے کھینچ کر پیچھے پھینکنا، اس قسم کے کچھ اسباب کو ہم جمع کرتے ہیں۔ اس کے بعد جہاز اپنے آپ اوپر اٹھنے لگتا ہے۔ اور پھر انجن کی حرکت سے آگے کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ اس کی سادہ مثال ایسی ہے جیسے غبارہ بغیر ہوا تو وہ زمین پر پڑا رہے گا۔ لیکن اگر آپ اس میں ہوا بھر دیں تو وہ اپنے آپ ہوا میں اوپر اٹھ جاتا ہے۔

زیورک میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اتفاق سے اردو جانتا تھا۔ ایران اور افغانستان وغیرہ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے گفت گو کے دوران کہا کہ اس وقت مسلمان ہر طرف محرومی کا شکار ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے دشمن ہر جگہ ان کے حقوق سلب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محرومی کے اس نظریہ نے مسلمانوں سے وہ عظیم چیز چھین لی ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر ان کو عطا کی تھی۔ اور وہ ہے دعوت کی طاقت اور داعیانہ منصب۔ داعی کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس ایک بہت بڑی چیز ہے جس کو وہ دوسروں کو دے

سکتے ہیں۔ مگر محرومی کے نظریے نے ان سے یہ دولت چھین لی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ محرومی کے احساس میں مبتلا ہوں وہ کبھی یافت کا پیغام دینے والے نہیں بن سکتے۔

زیورک سوئزرلینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاز میں ویڈیو پر اس کے جو مناظر دکھائے گئے اس میں وہ خوب صورت شہر کے روپ میں نظر آرہا تھا۔ تصویر میں یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ مگر حقیقت میں وہ ایسی حسین اور پر راحت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا کے ساتھ خوف اور حزن لگا ہوا ہے اس خوف اور حزن نے اس کو ساری معنویت کے باوجود بے معنی بنا دیا ہے۔ آخرت میں جب خوف اور حزن کو اس سے نکال لیا جائے گا تو دنیا اتنی پر لطف ہو جائے گی کہ آدمی ابدی طور پر اس سے محظوظ ہوتا رہے مگر وہ کبھی اس سے سیر نہ ہو۔

سوئزرلینڈ میں (اور اسی طرح تمام یورپ میں) مسافر کو ہر طرح کا تعاون دیا جاتا ہے۔ مثلاً سوئزرلینڈ میں آپ کو ٹرین سے سفر کرکے ایک ایسے شہر میں پہنچنا ہے جہاں سے آپ کو ہوائی جہاز پکڑنا ہے تو آپ آغاز ہی میں اپنے سامان کو ریلوے کے عملہ کو دیدیجئے۔ آپ کا سامان ٹرین سے اتار کر ہوائی جہاز میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور پھر اسی طرح آپ کی منزل پر آپ کو مل جائے گا۔

زیورک میں اگلے جہاز کے لئے ایک گھنٹہ قیام کرنا پڑا۔ زیورک کا ایرپورٹ بہت بڑا ہونے کے ساتھ بہت عمدہ اور منظم تھا۔ ایک مقام پر دیوار کے اوپر چمکدار حرفوں میں لکھا ہوا نظر آیا:

...your efficiency is our business.

(آپ کی ایفیشنسی ہمارا بزنس ہے) یہ چیز عملاً بھی یہاں ہر طرف نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ انڈیا کے لوگ بھی اگرچہ اس قسم کے الفاظ بولتے ہیں مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے کہا جائے تو انڈیا کا ماٹو شاید یہ ہوگا:

to exploit you is our business

زیورک (Zurich) سوئزرلینڈ کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے۔ یہاں دور تاریخ سے پہلے انسانی آبادی قائم ہو چکی تھی۔ ۵۸ ق م میں رومیوں نے اس علاقہ کو فتح کیا۔ اس کا موجودہ نام انھیں کا دیا ہوا ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں یہاں تین مسیحی مبلغوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی مقام پر آج یہاں کا کیتھڈرل بنا ہوا ہے۔ رومی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہاں فرانس کے مسیحیوں کی سلطنت قائم

ہوئی۔ اسی زمانہ میں شارلی مین (Charlemagne) نے موجودہ کیتھڈرل تعمیر کرایا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب ہارون الرشید بغداد کا خلیفہ تھا۔

زیورک کا ایئرپورٹ سوئزرلینڈ کا سب سے زیادہ معروف ایئرپورٹ ہے۔ یہاں سے ستر ملکوں کے ۱۱۰ شہروں کے لئے ڈائرکٹ فلائٹ حاصل کی جاسکتی ہے۔ اتصالات کے یہ کیسے عجیب مواقع ہیں جو موجودہ زمانہ میں ہر طرف کھل گئے ہیں اور حق کے داعیوں کو خاموش زبان میں پکار رہے ہیں کہ آؤ، ان نئے مواقع کو استعمال کرو اور خدا کا کلمہ خدا کے تمام بندوں تک پہنچا دو۔

زیورک ایئرپورٹ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر آجکل وہ جرمنی میں مقیم ہیں۔ وہ اس کانفرنس میں شریک تھے جو جرمنی کی وشو ہندو پریشد کی طرف سے اگست ۱۹۹۲ کے آخر میں فرینکفرٹ کی گوئٹے یونیورسٹی میں منعقد کی گئی۔ واضح ہو کہ گوئٹے (J.W.V. Goethe) نے کالی داس کا جرمن ترجمہ پڑھا تھا اور وہ اس کے خیالات سے متاثر تھا (10/376) اس کانفرنس کی تھیم تھی ــــ ہندوازم جدید دنیا میں:

Hinduism in the modern world

مذکورہ ہندو پروفیسر نے کہا کہ ہندوازم کا خلاصہ وحدت انسانیت (One world family) اور عدم تشدد (Non-violence) ہے مگر یہ تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ وہ مذہب جس میں اتنی وسعت ہے کہ وہ منکرین مذہب تک کو اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے، وہ اس وقت تعصب کے الزام کے مقابلہ میں اپنے دفاع پر مجبور ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندو مذہب کے بارہ میں جو غلط باتیں پھیلائی جارہی ہیں ان کا دفعیہ کریں، ورنہ بالآخر وہ ہندستان کی تصویر بگاڑنے والی ثابت ہوں گی:

We want to counter the disinformation now spreading regarding the Hindu religion; otherwise it will ultimately affect the image of India.

میں نے کہا کہ اگر آپ ہندوازم کی تصویر کو بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہئے کہ اس عمل کو بدلیں جو انڈیا میں وشو ہندو پریشد انجام دے رہی ہے۔ اس قسم کی تقریری کانفرنسوں سے تصویر درست ہونے والی نہیں۔

عجیب بات ہے کہ خود مسلمان بھی ٹھیک اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ موجودہ زمانہ میں وہ بے صبر ہو کر جگہ جگہ متشددانہ عمل کر رہے ہیں اور جب دنیا یہ کہنے لگتی ہے کہ اسلام تشدد کی تعلیم دیتا ہے تو فوراً وہ کانفرنس کر کے اعلان کرتے ہیں کہ یہ ڈس انفارمیشن ہے۔ ورنہ ہم تو جس مذہب پر ہیں وہ امن وسلامتی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہوا میں پرواز کرنے کا تخیل انسان کے اندر کب پیدا ہوا۔ اس کی کوئی قطعی تاریخ معلوم نہیں۔ تاہم تقریباً یقینی طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ پرواز کا پہلا خیال انسان کے اندر اس وقت آیا جب اس نے چڑیا کو فضا میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے دیکھا۔

غالباً مچھلی کو دیکھ کر انسان کے اندر پانی میں تیرنے کا خیال آیا اور چڑیوں کو دیکھ کر فضا میں اُڑنے کا۔ انسان نے جلد ہی کشتی بنا کر پانی میں تیرنا شروع کر دیا۔ مگر فضا میں اڑنے کا تخیل بہت دیر میں واقعہ بن سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ کشتی بنانے کا کام قدیم دستکاری کے دور میں بھی ہوسکتا تھا۔ مگر ہوائی جہاز بنانا صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ اس سے پہلے دنیا میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا ہو۔

دوسری کئی چیزوں کی طرح، ہوائی جہاز کو ترقی دینے میں جنگجویانہ ذہن کا بڑا حصہ ہے۔ فرانس کا لوئی چہاردہم (Louis XIV) ایک جنگجو بادشاہ تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ ایسی سواری بنائی جاسکتی ہے جو فضا میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے تو اس نے اس کام کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۶۶۰ میں اس نے اس کام کے لئے کچھ لوگوں کو ہر قسم کے وسائل دئے۔ تاہم ابتدائی نوعیت کی مشینی سواری (Powered flight) غالباً ۱۸۶۸ میں سومرسیٹ میں بنائی جاسکی۔ جہازوں کے ماڈل کو دیکھا جائے تو ان میں ایک تدریجی ارتقاء نظر آئے گا۔

۱۲ ستمبر کی صبح کو سوئس ایر کی فلائٹ کے ذریعہ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہم بروسیلز میں اتر گئے۔ یہاں کانفرنس کے لوگ رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا قافلہ شہر کے لئے روانہ ہوا۔ بروسیلز کی سڑکیں بہت صاف ستھری نظر آئیں۔ مکانات اور دکانیں بھی نہایت آراستہ تھے۔ ہر طرف پھیلا ہوا سبزہ اور خوشگوار موسم مزید اس میں اضافہ کر رہا تھا۔

بروسیلز میں میرا قیام بیلسن ہوٹل (Belson Hotel) کے کمرہ نمبر ۱۳۶ میں تھا۔ یہ شہر

کے کنارے خوبصورت مقام پر واقع ہے۔ ایک بار میں لفٹ میں تھا۔ اچانک بجلی چلی گئی۔ لفٹ رک گئی۔ اس کے اندر مکمل اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یاد تھا کہ اس کے اندر ٹیلیفون ہے۔ مگر میرے ذہن میں یہ تھا کہ اس سے پیغام دینے کے لئے کسی نمبر کو ڈائل کرنا ہوگا اور تاریکی کی وجہ سے نمبر کو دیکھنا اور اس کو ڈائل کرنا ممکن نہیں۔ اسی حیص بیص میں ریسیور اٹھایا تو اپنے آپ گھنٹی بجنے لگی۔

لفٹ کے ٹیلیفون پر نمبر ڈائل کئے بغیر صرف ریسیور اٹھانے سے گھنٹی بجتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو لفٹ کے اندر اندھیرا ہو جانے کے بعد ٹیلیفون کو استعمال کرنا ناممکن ہو جائے۔ اس کے بعد ہنگامی موقع پر اس ٹیلیفون کو صرف وہ شخص استعمال کرسکتا ہے جس کے پاس ٹارچ موجود ہو۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیش بندی کس چیز کا نام ہے۔ پیش بندی کسی بھی عمل کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

۱۲ستمبر کی شام کو لووین کی کیتھولک یونیورسٹی (Catholic University of Louvain) میں شرکاء کانفرنس کی اجتماعی ملاقات اور کھانا تھا۔ یہ یونیورسٹی چودھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔ اس میں ۲۵ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ دوسرے شعبوں کے ساتھ اس میں فیکلٹی آف تھیالوجی کا بہت بڑا شعبہ ہے۔ اس کے تحت اسلامک اسٹڈیز کا بھی انتظام ہے۔ یہ یونیورسٹی قدیم طرز کی نہایت عظیم عمارات میں واقع ہے۔

چودھویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ میں علم کا چرچا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ یہ زیادہ تر بغداد اور اسپین کے زیر اثر تھا۔ مگر بعد کے دور میں، بڑی بڑی سلطنتوں اور بڑی شخصیتوں کے باوجود، مسلم دنیا میں علم کا چرچا باقی نہ رہا۔ علم کا آغاز مسلمانوں نے کیا تھا، مگر اس کی تکمیل کے دور میں سارا کریڈٹ مغربی قوموں نے حاصل کر لیا۔ یہی علمی پس ماندگی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے نہ کہ فرضی سازشیں جس کا اعلان غلط طور پر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ ہر صبح و شام کرتے رہتے ہیں۔

یونیورسٹی دیکھنے کے بعد ہوٹل واپس آیا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ عین اس وقت کمرہ کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو ایک عرب نوجوان قاہرہ سے بول رہے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ انھوں نے بروسیلز میں ہمارے ٹیلیفون کا نمبر کیسے حاصل کرلیا۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے دہلی، لندن اور بروسیلز میں

کئی ٹیلی فون کئے۔ آخر کار ان کو معلوم ہو گیا کہ میں بروسیلز کے بیلسن ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۳۲ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ عرب نوجوانوں کی ایک جماعت لندن میں اور دوبارہ عرب نوجوانوں کی ایک جماعت قاہرہ میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس لئے میں اپنا ٹکٹ ری روٹ کرا کر واپسی میں لندن اور قاہرہ ہوتے ہوئے دہلی واپس جاؤں۔

اس واقعہ کے بعد مجھے فارسی کا مثل یاد آگیا کہ ڈھونڈنے والا پاتا ہے (جوینده یابنده) انسانی دماغ کی یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر وہ قیامت کے یوم الحساب میں مسئول قرار پاتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس پوزیشن میں ہے کہ وہ حقیقی طور پر جس چیز کا طالب ہو اس کو وہ جان سکے۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص موجودہ دنیا میں زندگی گزارتا ہے مگر وہ حق سے بے خبر رہتا ہے تو یہ لازمی طور پر اس کی اپنی کوتاہی ہے۔ اور جو شخص کوتاہی کرے وہ اس عالم اسباب میں اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔

مجھے ٹیلی ویژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے کمرہ کے ٹی وی سیٹ کو استعمال کرنے کا خیال بھی مجھے نہیں آتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ سرھانے کی چھوٹی میز پر ریموٹ کنٹرول کا سگرٹ پیکٹ جیسا آلہ رکھا ہوا تھا۔ اس کا سوئچ اتفاق سے دب گیا۔ اس کے بعد ٹی وی سیٹ کے شیشہ پر نہایت عمدہ رنگین تصویریں آنے لگیں۔ دیکھا تو سمندری زندگی اور جنگل کی زندگی کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ فطرت کا یہ منظر حیران کن حد تک عجیب تھا۔ محویت کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔ اس کو دیکھ کر یہ آیت زبان پر آگئی:
فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

قرآن میں فطرت کے مشاہدہ اور آیات کون پر غور و فکر کرنے کے لئے بہت زور دیا گیا ہے۔ اور اس کے علم کو خشیت الٰہی کا ذریعہ بتایا گیا ہے (إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ) اس سے معلوم ہوا کہ معرفت الٰہی کا اصل ذریعہ کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی نشانیوں پر غور کرنا ہے۔

ہمارے ہوٹل سے لووین کا فاصلہ ۳۰ کیلومیٹر ہے۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو جب میں اپنے ساتھی کے ہمراہ کار میں وہاں کی تقریب میں شرکت کے لئے جا رہا تھا تو سارے راستہ میں صنعتی ترقی کے مناظر دکھائی دئے سڑکوں سے لے کر عمارتوں تک ہر چیز واضح طور سے ہندستان سے مختلف نظر آئی۔

یہی تمام مغربی ملکوں کا حال ہے۔ میں نے سوچا کہ مغرب کے وسائل سے زیادہ وسائل ہندستان

کے پاس موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندستان اب تک ایک غیر ترقی یافتہ ملک بنا ہوا ہے۔ اس معاملہ پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ ہندستان کا مذہب لکشمی پوجا ہے اور مغرب کا مذہب جیون پوجا۔ ہندستانی آدمی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جیسے بھی ہو زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرے۔ اس کے مقابلہ میں مغربی انسان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے زندگی کو بہتر بنائے۔ ہندستانی آدمی زر اندوزی کو سب کچھ سمجھتا ہے جب کہ مغرب کے آدمی کے لئے سب کچھ یہ ہے کہ وہ حیات مادی کی تعمیر کرے ـــــ سوچ کا یہی فرق ہے جس نے دونوں دنیاؤں میں وہ فرق پیدا کر دیا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

۱۳ ستمبر کو ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر لیونارڈو شہر دکھانے کے لئے گئے۔ ڈاکٹر ثانی اثنین بھی میرے ساتھ تھے۔ شہر کا کچھ حصہ کار پر بیٹھ کر دیکھا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر لیونارڈو سے کہا کہ شہر کو زیادہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے پیدل چلنا چاہئے۔ اس لئے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو گاڑی کسی مقام پر پارک کر دیں اور ہم لوگ پیدل چل کر شہر کو دیکھیں۔ انھوں نے اتفاق کیا۔ چنانچہ گاڑی مسجد کے پاس پارک کر دی گئی اور ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے چل پڑے۔

برو سیلز نہایت منظم اور نہایت خوب صورت شہر ہے۔ سڑکیں نہایت عمدہ اور صاف ستھری ہیں۔ کہیں ٹوٹ پھوٹ کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ چاروں طرف گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ مگر نہ ہارن کی آواز تھی اور نہ دھواں۔ خوب صورت فوٹ پاتھ ہیں مگر خوانچہ فروشوں کا کہیں وجود نہیں۔ پارک ہیں مگر شور وغل نہیں۔ دکانیں ہیں مگر لوٹ نہیں۔ سرگرمیاں ہیں مگر بے قاعدگی نہیں۔ مکانات ہیں مگر غیر قانونی تعمیرات نہیں۔ سارا شہر ایک ڈھلا ہوا ماڈل نظر آتا ہے۔

ایک سڑک پر چلتے ہوئے ایک بہت بڑی عمارت نظر آئی۔ سیکڑوں لوگ اندر داخل ہونے کے لئے لمبی قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے گیٹ پر مقامی تلفظ میں لکھا ہوا تھا پارلی منٹ (Parlement) سامنے بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے اوپر بارہ ستارے بنے ہوئے تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ "یورپین پارلی منٹ" ہے۔ متحدہ یورپ کا تصور اس وقت مغربی یورپ میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بارہ میں شریک ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بارہ ستاروں کا جھنڈا اپنایا گیا ہے۔ اگر چہ ملکی قومیت کے ماننے والے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مگر اس تحریک نے عملی صورت اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اگر کسی وقت یورپ متحد ہو گیا تو یقینی ہے

کہ امریکہ نمبر ۲ پر چلا جائے گا۔

ایک بار برو سلز میں نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہاں میں مشرق کی سمت میں نماز پڑھ رہا ہوں اگر کوئی شخص مجھ کو دیکھ کر کہے کہ ہندستان میں تو آپ مغرب کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتے تھے اور بلجیم میں مشرق کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کیا آپ نے اپنا قبلہ بدل دیا۔ حالاں کہ اسلام میں جان بوجھ کر اپنا قبلہ بدلنا کفر کے ہم معنی ہے۔

یہ تنقید بظاہر صحیح مگر باعتبار حقیقت غلط ہوگی۔ کیوں کہ مسلمان کا اصل قبلہ مشرق یا مغرب نہیں ہے۔ بلکہ کعبہ ہے۔ ہندستان میں کعبہ چونکہ مغرب کی سمت میں واقع ہے اس لئے وہاں مغرب کے رخ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔ بلجیم میں کعبہ مشرق کے رخ پر ہو جاتا ہے اس لئے یہاں مشرق کے رخ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت (۱۳ اگست ۱۹۹۲) میں میں نے بلجیم کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ یہ بلجیم کے ایک سیاح سمٹ رونی سے نوائے وقت کے نمائندہ طاہر ملک کی گفتگو پر مشتمل تھی۔ بلجیم کو دیکھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مذکورہ سیاح کی بات تقریباً صدفی صد درست ہے۔ مزید یہ کہ اس نے جو بات پاکستان کے بارہ میں کہی، وہی ہندستان پر بھی پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے:

" میں چالیس سے زیادہ ممالک کی سیاحت کرچکا ہوں۔ مگر پولیس کی بہتات پاکستان میں سب سے زیادہ دیکھی ہے۔ یہاں بے شمار چیکنگ پوسٹ ہیں جہاں بلاوجہ شہریوں کو روک کر تلاشی لی جاتی ہے بلجیم میرا ملک ہے۔ وہاں نہ تو مسلح پولیس ہوتی ہے اور نہ ہی عوام کو روک کر جگہ جگہ چیک کیا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد میں عام افراد کے ہاتھوں میں سرعام اسلحہ پہلی بار دیکھ کر میں خوف زدہ ہوگیا" ان خیالات کا اظہار بلجیم سے پاکستان سیاحت کیلئے آئے سمٹ رونی نے نمائندہ نوائے وقت کے سوال پر کہ آپ کو پاکستان میں سب سے منفرد کیا چیز لگی؟ کا جواب دیتے ہوئے کیا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ ان کے ملک میں جرائم اور دہشت گردی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلجیم مکمل طور پر ایک پرامن ملک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلجیم میں قانونی طور پر پولیس، فوج اور عام شہریوں سمیت کسی کو آبادی میں سرعام اسلحہ لے کر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اپنی بات کی وضاحت

کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کے ملک میں قانون کے مطابق پولیس فوج یا لائسنس اسلحہ رکھنے والا کوئی بھی فرد شہری علاقوں میں اسلحہ کی نمائش نہیں کر سکتا۔

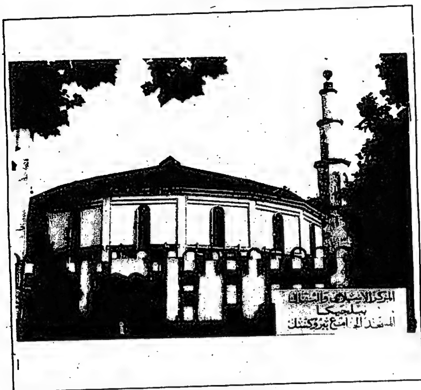
فوج کو عام حالات میں آبادی میں یونیفارم میں آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ قانونی طور پر فوج مسلح یونیفارم میں صرف ایمرجنسی کی صورت میں آبادی میں آنے کی مجاز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلجیم میں فوج کی چھاؤنیاں آبادی سے دور بنائی جاتی ہیں تاکہ عوام کا فوجی چھاؤنی سے گزر بھی نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ وہاں کی حکومت کے خیال میں آبادی کے علاقے میں قانون نافذ کرنے والے افراد کے پاس اسلحہ سے عام شہری کے خوف زدہ ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس طرح عوام اپنے مقابلہ میں پولیس یا فوج کو برتر خیال کرتے ہیں۔ پولیس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ پولیس اسلحہ کے بغیر اپنے فرائض انجام دیتی ہے اور صرف ضرورت کے وقت مسلح نظر آتی ہے۔ پولیس کا عوام سے رویہ نہایت دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے۔ جرائم کی روک تھام کے علاوہ پولیس عوام کی ذاتی مشکلات میں امداد بھی کرتی ہے جس کی مثال دیتے ہوئے سمٹ روئی نے کہا کہ اگر کسی شخص کی گاڑی راستے میں خراب ہو جائے تو پولیس خراب گاڑی کو درست کرنے میں مدد کرتی ہے یا اس شخص کو سرکاری سواری میں منزل مقصود تک لے جاتی ہے پاکستان سے موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ یہاں جگہ جگہ مسلح پولیس والے نظر آتے ہیں جو کہ عوام کے دوست ہونے کی بجائے اتھارٹی کا تاثر دیتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ وہ یہاں جب مسلح پولیس والوں کو دیکھتے ہیں تو تحفظ کی بجائے خوف محسوس کرتے ہیں۔ سیاحت کے حوالے سے اخراجات پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ان کا کل خرچہ ۵۵ ہزار روپے کے قریب ہوا ہے اور بلجیم میں ان کی تنخواہ ماہانہ ۲۷ ہزار پاکستانی روپے ہے۔ وہ ہر سال بونس ملنے پر چھٹیوں میں آسانی سے غیر ملکی سیاحت کے لئے نکلتے ہیں۔ یوں وہ ہر سال ایک یا دو ملک کی سیاحت کرتے ہوئے پوری دنیا دیکھنے کا خواب پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں (صفوہ ۲)

۱۳ ستمبر کو ہم نے بروسیلز کی جامع مسجد دیکھی۔ یہ مسجد شہر کی نہایت اہم سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس کا جائے وقوع نہایت شاندار ہے۔ اس کے ایک طرف مصروف سڑک کے کنارے شہر کی پر شوکت تجارتی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف بے حد وسیع پارک ہے۔ اور

اس کی وجہ سے دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ ایک گنبد کی یہ مسجد خود بھی نہایت عظیم اور پروقار عمارت کی صورت میں کھڑی ہوئی ہے۔

یہ مسجد رابطۃ العالم الاسلامی کے تعاون سے بنائی گئی ہے۔ اس کے دروازہ پر المسجد الجامع ببروکسل (Grande Mosque) لکھا ہوا ہے۔ ایک اور بورڈ بتا رہا ہے کہ اسی عمارت میں بلجیم کا اسلامی اور ثقافتی مرکز (المرکز الاسلامی والثقافی ببلجیکا) بھی قائم ہے۔ مسجد کے ساتھ وسیع احاطہ بھی موجود ہے۔ ہم یہاں ۱۲ بجے دن میں پہنچے تھے۔ اس وقت مسجد کے دونوں دروازے بند تھے۔ اس لئے ہم مسجد کے اندر داخل ہو کر تحیۃ المسجد ادا نہ کر سکے۔ دروازہ کے نوٹس بورڈ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: المسجد یفتح ابوابہ فی وقت الصلاۃ۔ یعنی مسجد کے دروازے نماز کے وقت کھلتے ہیں۔



اس کے بعد آگے بڑھے تو بروسیلز کا بڑا چرچ (St. Michael's Cathedral) نظر آیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ زائرین کا ہجوم اندر جاتا اور باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی شخص بروسیلز کی مسجد اور یہاں کے کیتھڈرل کے اس فرق کو دیکھ کر خود مسیحیت اور اسلام کے بارہ میں رائے قائم کرے اور کہے کہ دیکھو، مسیحی مذہب شاندار طور پر زندہ ہے اور اسلام کی عمارت پر قفل پڑ چکے ہیں تو بظاہر صحیح دکھائی دینے کے باوجود وہ ایک لغو بات ہوگی۔ کیوں کہ یہ ایک مقامی معاملہ ہے نہ کہ عمومی طور پر پوری دنیا کا معاملہ۔

بروسیلز کا یہ تاریخی کیتھڈرل مکمل طور پر پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اس کی عمارت پر ہیبت حد تک بلند اور عظیم ہے۔ وہاں مفت تقسیم کے لئے ایک پمفلٹ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس مقام پر ایک بڑا رومن چرچ (Romanesque church) تھا۔ اس کے کھنڈر پر ہنری اول (Henry I) کے حکم سے تیرھویں صدی میں ایک بڑا چرچ بنایا گیا۔ اس کے بعد تین سو سال تک اس میں تعمیرات جاری رہیں۔ شاہ چارلس پنجم (Charles V) کے زمانہ میں موجودہ عظیم عمارت کی تکمیل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک مذہبی تعلیمی ادارہ بھی ہے۔ یہاں مسیحیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کو چرچ کالج (collegiate church of SS Michael) کہا جاتا ہے۔

تعمیری عظمت کے اعتبار سے یہ کیتھڈرل یہاں کی مسجد سے بہت زیادہ بڑا ہے۔ مگر کیتھڈرل کے چاروں طرف صرف عمارتوں کا ماحول ہے۔ جب کہ مسجد کے اردگرد ہرا بھرا ماحول ہے۔ مسجد گویا ایک بہت بڑے پارک کے درمیان کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا، کیتھڈرل کے اندر زبردست سرگرمیاں تھیں لیکن مسجد میں اس وقت کوئی انسانی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ کیتھڈرل کے اندر مختلف قسم کے لٹریچر مسیحیت سے متعلق رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے لے لیا۔

۱۳ دسمبر کی شام کو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا۔ یہ بروسیلز سے ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر لووین (Louxain) کے اسپورٹس سنٹر میں رکھا گیا تھا۔ یہ سنٹر غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ اس کے جس ہال میں اجلاس کا انتظام تھا وہ اپنی غیر معمولی تعمیرات سے عجیب پر اثر معلوم ہو رہا تھا۔

وسیع ہال میں دو ہزار سے زیادہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد اور عورت موجود تھے۔ اس سے متصل ایک کمرہ میں اخباری رپورٹروں کا انتظام تھا۔ یہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ وہ خود ایک ہال کی مانند نظر آرہا تھا۔ یہاں مختلف یورپی اخباروں کے نمائندے کثیر تعداد میں جدید ترین سامانوں کے ساتھ موجود تھے۔

افتتاحی اجلاس میں زیادہ تر رسمی انداز کی تقریریں ہوئیں۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے اپنے مذہب میں امن اور انسانی ہمدردی کی اہمیت بیان کی۔ جاپان کے بدھسٹ پیشوا اتائی یامادا (Etair Yamada) نے بدھزم کی طرف سے جاپانی زبان میں تقریر کی۔ ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی ہے۔ وہ وھیل چیر کے ذریعہ ہال تک پہنچائے گئے تھے۔

زمبابوے کے وزیر اعظم رابرٹ موگابے (Robert G. Mugabe) نے انگریزی زبان میں پرجوش تقریر کی۔ ان کی تقریر پر سب سے زیادہ تالیاں بجائی گئیں۔ انھوں نے کہا کہ مسیح نے (اور دوسرے مذہبوں نے) یہ تعلیم دی ہے کہ پڑوسی کو اس کا حق دو۔ اس کا تعلق صرف فرد سے نہیں بلکہ قوموں سے بھی ہے۔ آج ہر قوم کا ایک "پڑوسی" ہے اور اس پڑوسی کے ساتھ اس کو مذہبی حکم کی تعمیل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سے نام گنوائے۔ مثلاً یہودی کے پڑوسی فلسطینی ہیں۔ ہندوؤں کے پڑوسی ہندستانی مسلمان ہیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے پڑوسی مسیحی ہیں اور مسیحی کے پڑوسی مسلمان وغیرہ۔ اسلام کی نمائندگی تیونس کے مفتی اعظم محمد مختار اسلامی نے کی۔ ان کی تقریر عربی میں ہوئی۔ تمام تقریروں کے ترجمے عین اسی وقت مختلف زبانوں میں کئے جاتے رہے۔

افتتاحی اجلاس کا اہتمام غیر معمولی حد تک بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ اس کا ہر جزء نہایت منظم اور باقاعدہ تھا۔ میرے قریب کی کرسی پر سوڈان کے شیخ اسحاق ادریس بیٹھے ہوئے تھے۔ آجکل وہ رابطۃ العالم الاسلامی (جدہ) سے وابستہ ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ : المسلمون لا یستطیعون ان یخططوا مثل ھذا التخطیط مع انہم یمتلکون کل الامکانیات فما ھو السبب۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ انانیت۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی بڑھی ہوئی انانیت نے انھیں اس کے لئے نااہل کر دیا ہے کہ وہ کوئی بڑا اجتماعی منصوبہ تیار کریں اور اس کو تکمیل

تک پہنچائیں۔

شام کا کھانا 'فیکلٹی کلب' میں تھا۔ یہ لووین یونیورسٹی کے تحت ہے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے خود ایک پوری دنیا ہے۔ میں نے قصداً گوشت نہیں لیا۔ صرف سادہ سبزی پر قناعت کی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ باہر گیٹ پر آئے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر لیونارڈ اور ڈاکٹر شانی اثنین تھے۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمی نے حسب قاعدہ واکی ٹاکی پر ہمارے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ ابھی کھانے میں مشغول تھا اس لئے وہ چند منٹ کی تاخیر سے پہنچا۔ گیٹ پر ہم لوگوں کو کھڑا دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا اس مقام پر گیا جہاں گاڑیاں پارک کی گئی تھیں۔ اور فوراً ہی گاڑی لے کر آ گیا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آ گئی کہ اذا نودی للصلاۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ۔ میں نے سوچا کہ آج دنیا کے بے شمار لوگ تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہے ہیں مگر دین کے لئے کوئی دوڑنے والا نہیں۔ اگر بظاہر کوئی شخص دین کے لئے دوڑ رہا ہے تو وہ بھی دین کے اس پہلو کے لئے ہے جس میں دنیوی اور مادی قدر پیدا ہو چکی ہے۔ دینی سرگرمیوں کے ہجوم میں دین کا وہ میدان بالکل خالی پڑا ہوا ہے جہاں دوڑنے میں کوئی دنیوی یا مادی کشش موجود نہیں۔

اس کانفرنس میں اٹلی کے لوگ کثرت سے شریک ہیں۔ ہوائی جہاز سے آنے والوں کے علاوہ ایک اسپیشل ٹرین روم سے یہاں آئی جس میں دو ہزار اطالوی سفر کر کے بروسیلز پہنچے ہیں۔

روم سے آنے والے ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے میرا کپڑا دیکھ کر پوچھا کہ اس کو انڈیا میں کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کرتا۔ پھر میں نے کہا کہ عربی میں اس کے لئے قمیص کا لفظ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اٹالین میں اس کو کیمشا (Kamisha) کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی اور اٹالین میں بہت سے مشترک الفاظ موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور اول میں عربوں اور اطالیوں کے درمیان کتنا زیادہ تعلق پایا جاتا تھا۔

۱۴ ستمبر کو کانفرنس کے تمام شرکا مختلف گروپوں میں تقسیم کر دئے گئے۔ ہر گروپ کے لئے الگ الگ موضوع مقرر کر دیا گیا جس پر وہ ڈسکشن کریں۔ اس طرح آٹھ الگ الگ ہال میں آٹھ الگ الگ اجتماعات ہوئے۔ ہر ایک میں کچھ منتخب لوگوں نے اپنے پیپر پیش کئے اور اس کے بعد ان پر بحث و تنقید ہوئی۔ موضوعات حسب ذیل تھے:

The great religions in dialogue : from Assisi to Brussels.
Religions, the Middle East and Europe.
1492-1992: the Churches of America and Europe.
Christians and Jews: their common responsibility in the new Europe.
South-North: the Churches of Africa and Europe.
Peoples, differences and the new Europe.
Voices of peace from Asia.
The economic responsibilities of the new Europe: the cost of peace.
Towards an Islamic-Christian dialogue.

اس طرح کی انٹرنیشنل کانفرنس کے انعقاد کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ شرکاء کو کسی ایک ہوٹل میں ٹھہرایا جائے۔ اور اسی ہوٹل کے کسی ہال میں تمام کارروائیاں انجام دی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کو ایک سے زیادہ ہوٹل میں ٹھہرایا جائے اور کانفرنس کی کارروائی بھی مختلف مقامات پر انجام دی جائے۔ موجودہ کانفرنس کے منتظمین نے دوسری صورت اختیار کی تھی۔ انھوں نے شرکاء کو دو ہوٹلوں میں ٹھہرایا اور تقریباً دس مختلف مقام پر اس کی کارروائیاں انجام پائیں۔

یہ صورت ذاتی طور پر میرے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں بار بار کار میں سفر کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کے سفروں میں مجھے چکّر آنے لگتا ہے۔ ہمارے استعمال کے لئے اگرچہ نہایت نفیس اور جدید کار موجود تھی۔ مگر بار بار آنے جانے سے میرے سر میں چکر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں شاید دنیا کا سب سے زیادہ کمزور انسان ہوں۔ میرا حال یہ ہے کہ پر تعیش ہوٹلوں میں ٹھہرنا اور شاندار کاروں میں سفر کرنا بھی میرے لئے عذاب کے ہم معنی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ آخر اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا کمزور کیوں بنایا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ شاید اس لئے کہ عجز کی سطح پر انسان کو حقیقت کی دریافت کا تجربہ کرایا جائے۔ کیوں کہ قدرت کی سطح پر حقیقت کی دریافت اتنی نادر ہے کہ ساری تاریخ انسانی میں وہ صرف پیغمبروں ہی کو حاصل ہوئی ہے۔ اس میں صرف چند ہی قابل ذکر استثنا رہائے جاتے ہیں، مثلاً عمر فاروق رضؓ۔

۲۴ ستمبر کے اجلاس میں میرا مقالہ تھا۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس کا عنوان " جدید چیلنج اور اسلام" مقرر کیا تھا۔ اس سشن کے لئے مجھ کو چیرمین بھی بنایا گیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ مجھے " بیک سیٹ" پر بیٹھنا زیادہ پسند ہے۔ اس لئے آپ چیرمین کسی اور کو مقرر کر دیں۔ میں صرف اپنا مقالہ پیش کر دوں گا اور اس کے بعد جو سوالات ہوں گے ان کا جواب دے دوں گا۔ میرے اصرار پر وہ لوگ راضی ہو گئے۔ چنانچہ میں نے اس اجلاس میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انگریزی میں تھا۔ انشاء اللہ اس کو انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

ایک عرب نے اپنی تقریر میں سیکولرزم کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ سیکولرزم کا ترجمہ عربی میں علمانیہ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ ترجمہ درست نہیں۔ اس کا صحیح ترجمہ لادینیت ہے۔ سیکولرزم سادہ طور پر صرف فصل الدین عن الدولۃ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب زندگی کے نظام کو غیر دینی بنیاد پر قائم کرنا ہے (المدلول الصحیح للعلمانیۃ ھو اقامۃ الحیاۃ علی غیر الدین)

میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو سیکولرزم کا مقصد مذہب کو رد کرنا (rejection) نہیں ہے بلکہ مذہب کے معاملہ میں ریاست کا غیر جانبداری (indifference) کی پالیسی کو اپنانا ہے۔ میں نے کہا کہ سیکولرزم کا نظریہ دراصل اس قدیم تصور کی تردید ہے جب کہ ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے کے معاملہ میں دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔

اس اعتبار سے سیکولرزم کی روح وہی ہے جو صلح حدیبیہ کی روح تھی۔ صلح حدیبیہ میں دونوں فریقوں کو اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملہ میں جنگی مداخلت نہیں کریں گے۔ اسی طرح سیکولرزم کے ذریعہ جدید ریاست نے اپنے آپ کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ مذہبی امور میں غیر جانب دار رہے گا۔ اس نظریہ نے موجودہ زمانہ میں دعوت کے وہ مواقع کھول دئے ہیں جو قدیم زمانہ میں موجود نہ تھے۔ چنانچہ آج دینی کام کے سب سے زیادہ مواقع سیکولر ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

بالفرض اگر سیکولرزم کا نظریہ اصولی طور پر ہمارے مطابق نہ ہو تب بھی اس کا عملی نتیجہ یقینی طور پر ہمارے حق میں ہے۔ کیوں کہ وہ ہم کو ریاست کے تدخل سے محفوظ رکھ کر دعوتی عمل کے مواقع دیتا ہے۔ اس لئے اگر کسی کو سیکولرزم سے نظریاتی اتفاق نہ ہو تب بھی عقل مندی یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ

ماحول کو دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کے نظری پہلو کو لے کر بے فائدہ طور پر اس سے الجھنا ہرگز دانش مندی نہیں۔

ایک مسیحی مقرر نے کہا تھا کہ اسلام میں فکری جبریت ہے۔ اسلام تنقید کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام دوسروں کے ساتھ مفاہمت نہیں کر پاتا۔ مراکش کے ایک عرب عالم نے اس کی تردید میں کہا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام میں نہ صرف تنقید کی اجازت ہے۔ بلکہ اسلام میں تنقید کو حد درجہ پسند کیا گیا ہے۔ اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کیا کہ اللہ اس آدمی پر رحم فرمائے جو مجھ کو میرے عیوب تحفہ میں دے (رَحِمَ اللّٰہ امرأً أھدیٰ إلیّ عُیوبی)

یہ بات نہایت درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے "دور فتنہ" میں تنقید کا دروازہ بند تھا۔ اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے بند دروازہ کو کھولا اور صحابہ وتابعین کے زمانہ میں ہر شعبۂ حیات میں اس کی شاندار عملی مثالیں قائم ہوئیں۔ یہ جمود اور زوال کی نشانی ہوگی اگر تنقید کو ناپسند کیا جائے یا اس کے دروازہ کو دوبارہ بند کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۴ ستمبر کو شام کا کھانا مالین کے بشپ کے یہاں تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکا وہاں لیجائے گئے۔ بشپ کی رہائش گاہ غیر معمولی طور پر بڑی اور شاندار تھی۔ چنانچہ اس کو 'پیلس' کہا جاتا ہے۔ تاہم اس پیلس کے اندر ہر چیز بالکل سادہ تھی۔ حتی کہ ڈنر بھی سادہ انداز میں دیا گیا تھا۔ صدیوں پرانے اس محل میں بہت سے بشپ نے قیام کیا ہے۔ ان سب کی تصویر میں ان کے سال پیدائش اور سال وفات کے ساتھ دیواروں پر پینٹنگ کی صورت میں نقش کی گئی تھیں۔

ایک مسیحی نے اپنا تعارف مانک (monk) کے لفظ سے کرایا۔ میں نے پوچھا کہ مانک نکاح نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ اپنے تجربہ کی روشنی میں بتائیے کہ مانک بننے کے بعد آپ کو اپنی زندگی میں تنہائی (loneliness) کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور بعض اوقات بے حد شدید ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ دین کی خدمت کے لئے غیر فطری طریقہ اختیار کریں اس کا سب سے پہلا نقصان خود ان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح ان کی شخصیت کا ارتقاء نہیں ہو سکتا۔

۱. راشٹریہ سہارا کی نمائندہ مسز الکا کوشک نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر کشمیر کی درگاہ حضرت بل کی تاریخ اور اس کے معاملات اور مسجد کے بارہ میں شرعی احکام سے تھا۔

۲. انگلش اخبار امرت بازار پتریکا کے نمائندہ مسٹر دنیش شرما نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کے دوران انھیں بتایا گیا کہ مسجد مقدس جگہ ہے۔ وہ عبادت کے لئے ہے۔ مسجد کو ہتھیاروں سے یا سیاسی سرگرمیوں سے پاک رکھنا چاہئے تاکہ مسجد کا مذہبی اور روحانی ماحول خراب نہ ہو۔

۳. انگریزی اخبار سنڈے آبزرور کے نمائندہ مسٹر راجیو سکسینہ نے ۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ "امتیازی سلوک" کے خلاف احتجاج بے فائدہ ہے۔ امتیاز زندگی کی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ امتیاز کو چیلنج کے روپ میں لیں نہ کہ ظلم کے روپ میں۔

۴. ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر عسکری زیدی نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق بابری مسجد کے مسئلہ سے تھا۔ ان کو وہ نقطۂ نظر بتایا گیا جو اس معاملہ میں قرآن وسنت کی رو سے مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہئے۔

۵. ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر جوہر عبد اللہ نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ کشمیر کے سلسلہ میں سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ خواہ کشمیر کا مسئلہ ہو یا غیر کشمیر کا، ہر جگہ حقیقت سے مطابقت کرنے میں کامیابی ہے۔ حقیقت سے ٹکرانے کا نتیجہ یکطرفہ تباہی کے سوا کچھ اور نہیں۔

۶ انڈیا پیس سنٹر (مدراس) کے تحت ناگپور میں نومبر ۱۹۹۳ کے پہلے ہفتہ میں ایک نیشنل اسٹڈی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کا موضوع تھا:

Minorities in India and the National Mainstream

منتظمین نے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی کہ وہ اس میں ۶ نومبر ۱۹۹۳ کو اختتامی خطاب

کریں۔ اس کے لئے ایک پیپر تیار کرلیا گیا تھا۔ مگر صدر (valedictory address)
اسلامی مرکز اس میں ذاتی شرکت نہ کرسکے۔ تیار کیا ہوا پیپر انھیں بھیج دیا گیا۔

۷ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے نمائندہ مسٹر مہاراج کرشن بھرت اور مسٹر ارن کمار پانڈے نے ۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق موجودہ ہندستان میں مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ آخری پیغام کے طور پر کہا گیا کہ زندگی مشکلات میں جینے کا نام ہے۔ اس لئے ہمیں مشکلات کی شکایت کرنے کے بجائے ہم کو مشکلات کو حل کرنے کی تدبیر کرنا چاہئے۔

۸ مسٹر ونود دوا (Vinod Dua) نے ۵ اکتوبر ۱۹۹۳ کو دور درشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ وہ ۶ اکتوبر کی شام کو نیشنل چینل پر دکھایا گیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا کہ موجودہ حالات میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ قرآن میں صبر کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ پورا قرآن گویا کتاب صبر ہے۔ قرآن میں براہ راست طور پر ڈیڑھ سو صبر کی آیتیں ہیں۔ اور بالواسطہ طور پر تقریباً ساری ہی آیتیں صبر سے تعلق رکھتی ہیں۔

۹ جرنل آف انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (نئی دہلی) نے نومبر ۱۹۹۴ میں ایک خصوصی شمارہ (Indian Horizons) کے عنوان سے شائع کیا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کو ۔۔۔ الفاظ پر مشتمل ایک مقالہ دینے کی پیش کش کی گئی۔ اس کے مطابق انھیں ایک مفصل مقالہ تیار کرکے دیا گیا۔ اس کا عنوان تھا (Plurality of Religions & Cultures)

۱۰ بی اے جی فلمس پرائیویٹ لمیٹڈ (نئی دہلی) نے ۸ نومبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ویڈیو پر ریکارڈ کیا۔ مسلمانوں کی الکشنی پالیسی کے سلسلہ میں بتایا گیا کہ داخلی سطح پر مسلمان جب تک منظم اور تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں محض الکشن میں کسی پارٹی کو ہرانے یا جتانے سے ان کو کچھ فائدہ ملنے والا نہیں۔

۱۱ آل انڈیا ریڈیو کی ٹیم ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا بیان اردو اور انگریزی میں ریکارڈ کیا۔ اس بیان میں کشمیری نوجوانوں کو اس پر مبارک باد دی گئی تھی کہ آج صبح وہ پر امن طور پر حضرت بل سے باہر نکل آئے اور درگاہ اور مسجد کو نقصان سے بچالیا۔ نیز انھیں یہ پیغام دیا گیا کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے مستقبل کی تعمیر کریں۔

۱۲ انگریزی اخبار امرت بازار پتریکا کے نمائندہ مسٹر دنیش شرما نے ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع خاص طور پر حضرت بل کا معاملہ تھا۔ ان سے کہا گیا کہ حضرت بل کا ایک مہینہ کا محاصرہ اگرچہ ایک المیہ تھا۔ مگر اس المیہ سے ایک بہتر بات نکل آئی۔ وہ یہ کہ کشمیری نوجوانوں کو محسوس ہوا کہ تشدد کا راستہ تباہی کا راستہ ہے۔ یہ ایک مثبت آغاز کی علامت ہے۔

۱۳ دوردرشن کی ٹیم ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو اردو میں اور انگریزی میں ریکارڈ کیا۔ اس انٹرویو میں آج صبح حضرت بل کے بحران کے خاتمہ پر کشمیری نوجوانوں کو اور حکومت کو مبارک باد دی گئی۔ اور یہ امید ظاہر کی گئی کہ اب کشمیر میں امن قائم ہو جائے گا اور وہاں کے لوگ دستور ہند کے تحت اپنی زندگی کی تعمیر پرامن طور پر شروع کر دیں گے۔

۱۴ مسٹر جواہر لال دویدی دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ وہ ذیل کے موضوع پر مقالہ تیار کر رہے ہیں ــــ تقسیم کے بعد دہلی کے مسلمانوں کا سیاسیات میں حصہ :

Political participation of Muslims in Delhi since partition.

۱۶ اپریل ۱۹۹۳ کو انھوں نے اس سلسلہ میں صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی ملاقات کی اور موضوع سے متعلق ان کے خیالات قلم بند کئے۔

۱۵ ترکی کے ایک پروفیسر عبدالحمید برالیشیق ترکش ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئے۔ وہ تفسیر قرآن کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ قرآن کی تفسیر میں تو ہزاروں کی تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ مگر جدید سائنٹفک اسلوب میں قرآن کی تفسیر لکھنے کا کام ابھی باقی ہے۔

۱۶ مسٹر ہلال عاطف (ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی) نے ۲۲ نومبر ۱۹۹۳ کو انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر مدارس عربیہ کے نظام اور کارکردگی کے بارہ میں تھا۔

۱۷ ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر سری نواس لکشمن (ٹیلیفون ۲۶۱۸۹۲۳) نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۲۲ نومبر ۱۹۹۳ کو ٹائمس آف انڈیا کی بمبئی اور دہلی دونوں اشاعتوں میں چھپا ہے۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ ملکی اور ملی مسائل سے تھا۔

۱۸ انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر کے نمائندہ مسٹر وینوگوپالن اور مسٹر پرمود کمار نے ۲۴ نومبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق ہندستان میں ہندو مسلم تعلقات نیز مسلم مسائل سے تھا۔

۱۹ فیچر اینڈ نیوز الائنس (Feature & News Alliance) کے نمائندہ مسٹر ایم اے سراج نے ۲۸ نومبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر اس سوال سے تھا کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانان ہند کا عملی نقشہ کیا ہونا چاہئے۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ بھی ہے کہ نزاعی معاملات میں آئیڈیل پر اصرار نہ کرتے ہوئے عملی حل کو قبول کر لیا جائے۔

۲۰ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر عزیز برنے ۳۰ نومبر ۱۹۹۳ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر الکشن کے موجودہ نتائج سے تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ اس الکشن کا ایک امید افزا پہلو یہ ہے کہ اس میں کیونل اشوز کو دوبارہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

۲۱ واشنگٹن کے جرنل ای آئی آر (Executive Intelligence Review) کی دو نمائندہ لنڈا ڈی ہویوز اور سوسن براڈسی نے یکم دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق دو چیزوں سے تھا۔ فیملی پلاننگ کے بارہ میں اسلام کا نقطۂ نظر۔ انڈیا میں مسلمانوں کا مستقبل۔

۲۲ اسلامک ریپبلک نیوز ایجنسی (ارنا) کے نمائندہ مسٹر سعید عالم نے یکم دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر سلمان رشدی کا مسئلہ، حالیہ ریاستی الکشن کا رزلٹ، بابری مسجد کے مسئلہ کا حل سے تھا۔

۲۳ ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ مسٹر رام بہادر رائے نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا جو جن ستا کے شمارہ ۲ دسمبر ۱۹۹۳ میں شائع ہوا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر دو چیزوں سے تھا۔ بابری مسجد، ریاستوں کا موجودہ الکشن اور مسلمان۔

۲۴ بی بی سی (لندن) کی خاتون نمائندہ جلین رائٹ (Gillian Wright) نے ۲ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلام کے بعض عقائد اور عبادات تھا۔ نیز ہندستان میں مسلمانوں کے مسائل پر بھی مختصر گفت گو ہوئی۔

۲۵ انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس کے سینئر کرسپانڈنٹ مسٹر جے رائنا نے ۴ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ نومبر ۱۹۹۳ کا ریاستی الکشن ایک اعتبار سے گویا ریفرنڈم تھا۔ یوپی میں بی جے پی کی حکومت نہ بننا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ رام مندر بنانا یا دوسری مسجدوں کو ڈھانا یہ ہندو کا مین کنسرن نہیں۔ یہ انٹرویو ہندستان ٹائمس کے شمارہ ۵ دسمبر ۱۹۹۳ میں چھپا ہے۔

۲۶ ہندی اخبار ہندستان کے نمائندہ مسٹر موہن سنگھ نے ۱۱ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نیشنل اشوز سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنی فطرت کے تحت مل جل کر ہی رہنا چاہتے ہیں۔ مگر نااہل لیڈر جھوٹے اشو کو بھڑکا کر دونوں کے درمیان گڑبڑ کراتے رہتے ہیں۔

۲۷ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی۔ اس تقریر کا تعلق کیرکٹر بلڈنگ سے تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ سماجی زندگی میں ایک فرد کو کامیابی اور ترقی کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

۲۸ امریکی ادارہ (International Religious Foundation) کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر ٹامس والش (Thomas G. Walsh) ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے انٹر ریلجس ڈائیلاگ کے موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کی اہمیت سے اتفاق کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا کہ اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان ٹکراؤ کے بجائے ہم آہنگی کی فضا پیدا کی جائے۔

۲۹ بھارتیہ آریہ پرتی نیدھی سبھا کے زیر اہتمام ۱۹ دسمبر ۱۹۹۳ کو ایک جلسہ ہندو مہاسبھا بھون (دہلی) میں ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ہندو مسلم اتحاد اور شانتی کے موضوع پر تقریر کی۔

۳۰ امریکہ (لاس اینجلیز) میں دسمبر ۱۹۹۳ میں انٹرنیشنل سیرت کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سیرت کے موضوع پر ایک پیپر پیش کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

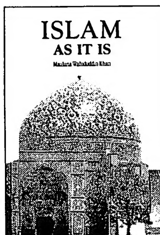
۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے ناس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is,* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

